فاخرہ جبیں

جہاں آرا تمنا

صبح کا وقت ہے اور افراتفری کا وہ عالم کہ کسی کو کچھ سجھائی نہیں دے رہا۔

یونیورسٹی والوں کی بس چھوٹی جارہی ہے۔ اسکول والوں کی وین پاں پاں کررہی ہے۔ تایا ابو دیر کرنے والوں کو گھور رہے ہیں۔ بڑے چچا دیر ہونے پر بڑبڑا رہے ہیں اور چھوٹے چچا بڑے صبر سے منہ ہاتھ دھوئے۔ بلکہ باندھے اپنی باری کے انتظار میں ہیں۔

"بھنڈی چیخ رہی ہے کہ" ناشے کا ایک وقت ہی کیوں مقرر ہے۔ اور کچھ لوگ رات کو ہی ناشتہ کیوں نہیں کرلیتے۔"

خود اس کا اپنا یہ حال ہے کہ صبح صبح نہادھو، چوٹی بنائے کچن میں جو گھسی تو اب دوپٹہ گول مول ہو کر ایک کونے میں پڑا ہے۔ آستین کہنیوں سے اوپر پہنچ گئی ہے۔ بائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی گرم گھی میں ڈبو کر لال کرچکی ہے۔ چائے چھلکنے سے پیر کی انگلیاں سوج چکی ہیں مگر یہ چوٹیں معمول کی ہیں۔ لہٰذا وہ برق رفتاری سے سب کچھ بھلائے پراٹھے بیل رہی ہے۔ سلائس جلا رہی ہے۔ انڈے اور برتن توڑ رہی ہے۔ ہاتھ جوڑ رہی ہے۔ بھابھی کے سامنے۔

ایسے میں شاہ زین کی آمد کا اعلان جس کسی نے بھی

ناولٹ

سنا' بے اختیار ہو کر اپنا سر تھام لیا۔ کسی کسی نے البتہ دیوار اور در بھی تھام لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"دیکھو بھلا۔ یہ مدیحہ کو کیا سوجھی۔؟ گھر بھرا ہوا ہے لڑکیوں سے۔ اور وہ بھیج رہی ہے جوان جہان لڑکے کو رہنے کے لیے۔" تائی اماں سے ایسی نا سمجھی کی امید تو نہ تھی۔ خدا جانے کس رو میں یہ بات کہہ گئیں۔

بڑی' چھوٹی چچی نے گڑبڑا کر ایک دوسرے کو دیکھا اور اس سے پہلے کہ تائی اماں کی یہ بات گھر کے خرانٹ بوڑھوں تک پہنچتی اور وہ گھر کے بجائے کسی ہوٹل میں شاہ زین کے قیام و طعام کا بندوبست فرماتے بڑی' چھوٹی چچی نے تائی اماں کو دونوں طرف سے دبوچا اور ان کے ہائیں ہائیں' ارے۔ ارے کی پروا کیے بغیر انہیں پچھلے صحن میں لا چھوڑا جہاں گنگو دھوبی گھر کے پینتیس افراد کے میلے کپڑے دھونے کے لیے واشنگ مشین' ڈرائیر مشین اور واٹر پمپ ایک ساتھ چلائے بلا کا مصروف تھا۔

"بڑی بھابھی! یہ کیا غضب۔؟ ذرا سوچیں۔" بڑی چچی کے لب تیز تیز ہل رہے تھے۔ یقیناً" کچھ بول بھی رہی ہوں گی مگر تائی اماں کے پلے کچھ پڑتا تب ناں۔ انہوں نے جھنجھلا کر گنگو دھوبی کو دفعان کرنے کا اشارہ کیا۔

وہ بیچارا چھورا چھو۔ چھوا چھو۔ تو اس دور میں کرنے سے رہا۔ مشینوں کی گھرر گھرر۔ زوں۔ شوں ۔۔ اور بھاری کپڑوں پہ ڈنڈے کی دھائیں دھائیں البتہ ضرور مخل ہو رہی تھی۔

چھوٹی چچی نے جھٹ اپنے گلابی کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر لال نوٹ نکالا اور لے جا کر گنگو کے ہاتھ پہ دھرا۔

"یہ لو میاں جاؤ! گھڑی بھر کے لیے جان چھوڑو۔ کوئی چائے' پان' قلفی' شربت کھا پی لو جا کر۔"

گنگو کو اور کیا چاہیے تھا۔؟ پیسے دبوچے۔۔۔ کورنش بجاتا۔۔۔ یہ جا' وہ جا۔۔۔ اتنے میں بڑی چچی بات شروع کر چکی تھیں۔

"چار ماموؤں کا اکلوتا بھانجا۔۔۔ اور چار بھائیوں کی اکلوتی بہن مدیحہ! ذرا جو آپ کی باتوں کی بھنک بھی اسے پڑ گئی تو ذرا سوچیے' کتنا دل دکھے گا۔ بے چاری کا۔۔۔ وہ پڑھا لکھا' سلجھا ہوا شاہ زین۔ کوئی ہماری لڑکیوں کو بھگانے' بہکانے تھوڑی آ رہا ہے جیسے باقی سب بہن بھائی مل کر رہ رہے ہیں۔ چار دن وہ بھی آ کر رہ لے۔"

بڑی چچی ذرا پردے میں رہ کر بات کر رہی تھیں۔ چھوٹی چچی کو یہ بات کچھ خاص نہ بھائی تھی۔

بڑی تائی گھر کے کرتا دھرتا ماؤں میں سے ایک تھیں۔۔۔ بھلا ان سے کیونکر چھپایا جا سکتا تھا۔ انہوں نے صاف صاف بات کرنے کی ٹھانی۔

"بڑی بھابھی! میں تو سیدھی اور صاف بات کہوں گی۔ مدیحہ کئی بار ذکر کر چکی ہے کہ شاہ زین کے لیے خاندان سے ہی لڑکی پسند کرے گی۔ ہو سکتا ہے وہ دانستہ اسے یہاں بھجوا رہی ہو۔ آپ تو خیر سے بری الذمہ ہیں۔ ہمیں دیکھیے راتوں کو نیند نہیں آتی۔"

انہوں نے پوری کوشش کی آنکھیں پھیلا کر بے خوابی دکھانے کی حالانکہ نوجوان نسل گواہ تھی کہ بستر پر جاتے ہی ہیبت ناک خراٹے لینے والی یہ ہی محترمہ تھیں۔

"دو صائمہ بھابھی کی۔۔۔ تین میری۔۔۔ لڑکیاں کیا۔۔۔ بھاری سلیں دھری ہیں سینے پہ۔۔۔ اب اپنے ہی اپنوں کا نہ سوچیں تو۔۔۔ میں تو کہتی ہوں۔۔۔ بھائی صاحب سے کہہ کر کمرہ ذرا اچھا سا سیٹ کروا دیں۔۔۔ دو' چار دنوں کی تو بات نہیں۔۔۔ ابھی جگہ خریدے گا۔ پھر مکان بنے گا۔۔۔ مدیحہ کے شفٹ ہونے تک آخر وہ یہیں رہے گا ناں۔۔۔؟ اور ماشاءاللہ سے ہماری بچیاں' نیک' سلیقہ مند' با اخلاق' باکردار۔ ہو سکتا ہے۔ یہیں کہیں میل' جوڑ لکھا ہو اس کا۔"

"یہ تو ٹھیک کہا تم نے۔۔۔ میں بھی سٹھیا گئی۔۔۔ بھلا پہلے یہ بات کیونکر نہ سوچی۔ اچھا تم لوگ ذرا دوپہر کا ہانڈی' چولہا دیکھ لو۔۔۔ میں کچھ سوچتی ہوں اس بارے میں۔"

انہوں نے تخت پر ٹانگیں پھیلائیں اور ململ کا دوپٹہ منہ پہ پھیلا کر اونگھنے لگیں۔۔۔ ان کا اونگھنا بھی کمال کا ہوتا تھا۔۔۔ اسی اونگھ میں وہ غور و فکر کرتیں۔۔۔ معاملات سلجھاتیں۔ مسائل حل کرتی تھیں۔

"ماؤں کو بیٹیوں کی کتنی فکر ہوتی ہے۔" ان کی جڑی ہوئی پلکوں میں ہلکی سی لرزش تھی۔ خود وہ ایک اکلوتے بیٹے کی ماں تھیں۔ گھر بھر میں سب سے بڑا بیٹا شیراز حسن۔۔۔ اعلا تعلیم یافتہ۔۔۔ خوبصورت۔۔۔ اونچا لمبا۔۔۔ ادھر تعلیم سے فارغ ہوا۔ ادھر پسند سے منگنی بھی کروالی۔۔۔ پہلا ہنگامہ تھا گھر کا۔ کیا ہی اودھم مچا تھا۔۔۔ لڑکے' لڑکیوں نے خوب ہی مزے کیے۔ گانے گائے' ڈھول پیٹے۔۔۔

خوشی کے نقاروں نے اس سانحے کی سسکیوں کی بازگشت ان کے کانوں تک پہنچنے ہی نہ دی جس نے شیراز حسن کو ایک ٹانگ کی معذوری و محرومی دی تھی۔ محبت آزمائش بن گئی۔۔۔ اور ہر آزمائش پر پورا نہیں اترا جا سکتا ان کی محبت داغ جدائی دے کر زخموں سے کھرنڈ بھی نوچ کر لے گئی۔۔۔ اور وہ آہ کیے بغیر اپنے کمرے کا ایک لازمی سا جزو بن کر رہ گئے۔۔۔ اب نہ ان کا کمرہ انہیں چھوڑتا تھا' نہ وہ کمرے کو۔

مجبوری لاچاری کے ان دنوں میں ٹی وی اور کمپیوٹر کا زیادہ ساتھ رہا۔ علم پہلے سے تھا' عقل اور شعور کو جلا ملی تو اخبارات سے وابستہ ہو گئے۔

تمام لڑکوں کی سیاسی محفل ان ہی کے کمرے میں جمتی پاتی تھی۔۔۔ جن دنوں لڑکے اپنے امتحانات سے فارغ ہوتے' ان کے کمرے میں خوب ہی رونق رہتی۔ چائے' تبصرے' گرما گرمی' کھیل' تماشے' راز بھری باتیں۔۔۔ وہ گھر کے ہر فرد کے دوست تھے۔۔۔

"اور اگر میں کہوں۔ میرے بیٹے کے لیے۔۔۔ خوشی کی کوئی کرن۔۔۔ امید کا کوئی جگنو۔۔۔ کوئی آسرا' کوئی سہارا دے دو تو شاید صائمہ اور عفت یہ بھاری سلیں اپنے سینے سے ہٹانا کبھی پسند نہ کریں۔" تائی اماں نے کروٹ بدلی۔

جامن کے درخت پر طوطوں نے خوب ہی شور مچا رکھا تھا۔۔۔ اور اس سے پرے شہتوت کے درختوں پر چڑیوں کی چڑچوں۔۔۔۔

"بیٹیاں بھی تو چڑیوں کی مانند ہوتی ہیں۔۔۔ چہکتی لہکتی۔۔۔ پھر سے اڑ جانے والی۔۔۔۔"

پانچوں بچیوں کے چہرے ان کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئے۔۔۔۔

صائمہ کی بڑی بیٹی ارم تھی۔۔۔ ڈاکٹری کے آخری سال میں۔۔۔ دبلا پتلا جسم۔۔۔ لمبی چوٹی' سیاہ آنکھیں اور دودھ شہد سے بنی رنگت۔۔۔ خوش اخلاق اور مہربان ڈاکٹر' فرماں بردار حد سے زیادہ۔

اس سے چھوٹی افشین تھی۔ گھونگھریالے بال ہمیشہ کندھوں پر گرائے رکھتی۔۔۔ اسے بس کاغذ' رنگوں اور تصویروں سے پیار تھا۔۔۔ آرٹ گیلریز میں اکثر آنا

جانا رہتا تھا بی ایس سی سے آگے پڑھ کر نہ دیا۔ دوسروں کے معاملات میں دخل نہ دیتی اور اپنے معاملات میں دخل دینے نہ دیتی تھی۔۔۔ رنگ' روپ میں کسی سے بھی کم نہ تھی۔

عفت کی تین بیٹیاں تھیں۔۔۔ ضوبیا' اریبہ' فرح۔

فرح فیشن کی دلدادہ تھی۔ فربہ جسم۔۔۔ سپید رنگت' بھرے بھرے ہونٹ۔ آنکھیں ذرا چھوٹی تھیں مگر کاجل میں ڈوبی رہنے سے بڑی بڑی لگتی تھیں۔ گھر میں سب سے زیادہ کپڑے' خرچے اور نخرے اسی کے ہوتے تھے۔

اریبہ کم گو سی لڑکی تھی۔ مزاج سنجیدہ اور کسی حد تک تند تھا۔ اس لیے اسے کم ہی چھیڑا جاتا۔۔۔ شکل وصورت میں وہ بھی اچھی تھی۔ پلکیں لانبی لانبی اور خوبصورت تھیں۔ ایک ادا سے اٹھتی تھیں۔ سارا حسن قدرتی تھا۔۔۔ وہ خود کوئی تردد نہ کرتی تھی۔

ضوبیا ایم اے کے آخری سال میں تھی۔ چلبلی طبیعت' شرارتی' لڑکیوں سے کم' لڑکوں اور بچوں سے زیادہ بنتی تھی اس کی۔ بے فکری' خوش حالی اور تازگی اس کی طبیعت کا خاصا تھا۔۔۔ سارا دن ٹی وی سے جڑی رہتی۔ بہت کام ہوتا تو یہ کہ میاں مٹھو کو بسکٹ' ٹافیاں کھلا دیں۔ کلیاں توڑ کر چائے کی میز پہ سجا دیں اور کبھی کچھ نہ سوجھا تو ربڑ کی گیند لے کر ٹپ۔ ٹپ سارے صحن میں گھوما کرتی۔ انچاس' پچاس۔ اکاون۔ سامنے آنے والوں کو چیخیں مار کر ہٹا دیتی۔

خود گھومتی گھماتی۔ کبھی کسی کرسی سے ٹکراتی' کبھی برآمدے کے ستونوں سے۔۔۔ تو کبھی گملوں پر براجمان ہوتی۔۔۔ ایک بار زور کا ٹپہ لگا اور گیند اڑتی ہوئی تایا ابا کی چائے میں۔ تب گھر بھر سے ڈانٹ پڑی۔ گیند بلال بھائی کے قبضے میں چلی گئی۔ چند دن خوب ہی سکون رہا۔ پھر ایک روز جنون بڑھا۔ تو سنگھاڑا جو صبح و شام گھر کی صفائی کے لیے آتا تھا۔ چپکے سے اسے گیند تھما گیا۔ تب سے شام دوبارہ ٹپ ٹپ کی آواز سے آباد ہو گئی تھی۔

تائی اماں اونگھتے ہوئے مسکرا رہی تھیں۔ وہ ان کی گنگو شاید واپس آگیا تھا۔ گھر۔۔۔ گھر۔۔۔ زوں شوں کی آوازیں سوچوں میں خلل پیدا کر رہی تھیں۔ انہوں نے ناگواری سے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈالا۔۔۔ پھر یاد آیا۔ پرس ان کی خواب گاہ کے تکیے تلے ہوتا ہے۔

لمبی سانس لے کر انہوں نے مندی مندی آنکھیں کھولیں۔ اور پھر یک لخت ہی چونک اٹھیں۔ ان پانچ چہروں کے پیچھے سے ایک اور چہرے نے اپنی جھلک دکھلائی تھی۔ عظمیٰ تایاب عرف اوما۔

انہیں حیرت ہوئی۔ چھوٹی' بڑی چچی کے ساتھ ساتھ انہوں نے خود بھی اسے یاد نہ رکھا تھا۔۔۔ کیوں۔؟

شاید اوما اس لسٹ میں کہیں تھی ہی نہیں۔ سب سے اوپر۔۔۔ نہ سب سے نیچے۔

☆ ☆ ☆

"ارے میں کب کہتی ہوں کہ کوئی شہزادہ' کوئی چندے آفتاب' ماہتاب ڈھونڈ کر لاؤ۔ ہمیں تو کوئی انسان کا بچہ چاہیے بس۔۔۔ گھر بار ہو' اچھا کماتا ہو اور ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔ ساس' نندیں' دیور کسی پر اعتراض نہیں۔ میری بچی کو عادت ہے بھرے گھر میں رہنے کی۔۔۔ بچپن سے دوسروں کو پکاتی' کھلاتی آئی ہے۔ ایم اے پاس ہے۔ سولہویں درجے کی ملازمت کر رہی ہے۔ شکل وصورت میں کسی سے بڑھ کر نہیں تو کم بھی نہیں۔"

"امی کتنی ذہین ہیں۔ ایسی رٹی رٹائی تقریر۔ رشتے والی خالہ بدل گئیں مگر اس تعارفی بیان میں کوئی ادل بدل نہیں۔" اسے خوامخواہ ہی ہنسی آگئی۔

اور اس رشتے کے پیچھے اس نے خود کو کتنا بدل ڈالا تھا۔

بالوں کے بڑھنے کی رفتار کوئی خاص نہیں تھی۔ لہٰذا لاغر سی چوٹی بنانے کے بجائے انہیں کندھوں تک خوبصورتی سے ترشوا لیا تھا۔ پچھلے مہینے امی نے عینک کی جگہ لینس لگوا دیے تھے۔ لو جی۔ ایک اور مصیبت۔۔۔ لینس لگائے کون؟ اتارے کون۔۔۔؟ صبح صبح کسی کو

ہاتھوں لیے میں دوڑی پھرتی۔۔۔ ادھر لگاتی۔۔۔ ادھر پھڑک کر باہر۔۔۔ کبھی الٹا لگ جاتا۔۔۔ لڑکیوں کے ہاتھ تو سمجھو لطیفہ ہی لگ گیا۔ بس نہیں لگا تو کوئی معقول رشتہ ہی اماں کے ہاتھ نہ لگا۔ چنانچہ ہر مہینے پارلر میں حاضری لازمی کر دی گئی تاکہ مختلف کریموں سے سانولا رنگ تو کہیں دبا ہی رہے۔ وہ پوری طرح اپنے آپ کو فٹ رکھنے کی کوشش کرتی۔

عام لڑکیوں کی طرح اس بات کو نہ اپنے لیے مسئلہ بناتی نہ دوسروں کے لیے۔ رشتہ نہ ملنا اس کے لیے نہیں' امی کے لیے مسئلہ تھا اور وہ خود ایسی باتوں پر پریشان نہیں ہوتی تھی۔ خصوصاً "شادی' بیاہ کا معاملہ۔۔۔ اس کا ایمان تھا' دیر' سویر سب اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ رشتے بھی آسمانوں پر ہی طے پاتے ہیں۔ پھر ان باتوں پہ خواہ مخواہ کی ٹینشن کیوں۔؟ ہاں امی کے اطمینان کے لیے آنے والے رشتوں میں خوب ہی دلچسپی لیتی۔۔۔ خود لڑکے کا بائیو ڈیٹا سننے بیٹھ جاتی۔۔۔ ایک دفعہ صرف اس لیے رشتہ واپس کر دیا کہ لڑکے کا نام "دین محمد" تھا۔ "بس تب تو امی جو اس سے خفا ہوئیں تو انہیں منانے کے لیے اسے انجمامی کا سہارا لینا پڑا تھا۔

"دین محمد" البتہ راتوں کو خوابوں میں آ آکر اسے ڈراتا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"میں نے کہا۔ شاہ زین آرہا ہے۔"

"کہاں ہے۔۔۔؟" تایا ابا نے سر اٹھا کر اطراف میں دیکھا۔

"میں نے یہ کب کہا کہ ابھی چلا آرہا ہے۔ آجائے گا کچھ دنوں تک۔۔۔" تائی امی قدرے برا مان کر کہا۔

"کافی دنوں سے سن رہا ہوں۔ یہ کوئی نئی اطلاع نہیں۔"

"جی ہاں۔ پرانی اطلاع ہے مگر بہتر ہو گا ذرا اس پر غور فرمالیں۔"

"کس پر۔۔۔؟" ان کی تمام تر توجہ ٹی وی اسکرین پر تھی۔

"شاہ زین کی آمد پر۔"

"اس میں غور فرمانے والی کوئی بات ہے۔؟"

"جی نہیں۔ غور فرمانے والی بات صرف بشریٰ انصاری میں ہے۔" تائی اماں چیخ کر بولیں تو وہ سٹپٹائے۔

"ایک تو یہ عورت۔۔۔" انہوں نے پہلو بدل کر بے چارگی سے ٹی وی اسکرین پہ چمکتی صائمہ چودھری کو دیکھا۔

"ڈولی کی آئے گی بارات" ایسا ڈرامہ نہ تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر بیگم کی بور ترین باتوں پر توجہ دیتے۔

"مسئلہ کیا ہے؟"

"شاہ زین کو ٹھہرانا کہاں ہے؟"

"اس دو کنال کے گھر میں اس کے ٹھہرنے کے لیے کوئی جگہ نہیں۔" انہیں غصہ آیا۔

"دو کنال کے گھر میں 35 افراد بھی رہتے ہیں۔" تائی اماں نے جتایا۔

"اوپر کا کوئی کمرا صاف کروالو۔" آسان سا حل تھا۔

"اوئی۔ مارنا ہے اسے۔؟"

"کیوں۔۔۔ اوپر کوئی پھانسی گھاٹ ہے کیا۔۔۔؟"

"لاحول ولا۔۔۔ کیسی بات کر رہے ہیں آپ۔ میرا مطلب تھا' وہ ٹھنڈے علاقے سے آئے گا۔ اوپر تو غضب کی گرمی۔ اس پر لوڈ شیڈنگ۔ بچہ بے چارہ تو پگھل جائے گا۔"

"تو بچے نے یہاں کرنے کیا آنا ہے۔؟ اسے نہیں معلوم یہاں کے حالات۔ اور ٹھیک ہے اس نے رہنا ہے تو برداشت کرے۔ گرمی بھی اور لوڈ شیڈنگ بھی۔"

صائمہ چودھری کا رنگ چڑھ رہا تھا۔

تائی اماں چپ چاپ باقی کی بات منہ میں لیے اٹھ گئیں۔۔۔ اور سیدھی بڑے چچا کے بلال کے پاس جا پہنچیں۔

وہ ٹراؤزر اور بنیان پہنے بیڈ پہ پھیلا ہوا تھا۔ دونوں

ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے چہرے پر مساج کر رہی تھی۔
"ارے تائی اماں! آپ۔ آیئے ناں۔۔۔" بلال جھٹ مودب ہو بیٹھا۔
تائی اماں بیٹھیں اور نئے سرے سے شروع ہو گئیں۔ بلال چپ چاپ سنتا رہا۔
پہلے تایا ابا کی شکایتیں۔ پھر اصل مسئلہ۔
"یہ تمہارے تایا، چچا انتہا درجے کے کنجوس۔۔۔ ایک روپیہ تک نہ خرچیں گے۔ لیکن وہ اکلوتا، ماں کا لاڈلا۔۔۔ میں چاہتی ہوں، مدیحہ کو کوئی شکایت نہ ہو۔"
"بس اتنی سی بات تائی اماں! آپ مجھے حکم کر کے بلا لیا کریں۔ یہ بھی کوئی مسئلہ ہے۔" بلال سر جھٹک کر مسکرایا۔
اگلے روز دوسری منزل کے سب سے تاریک کمرے کو صاف کیا گیا۔ نیا کارپٹ، نیا بیڈ، پردے، کشن، الماریاں، وال کلاک، منی پلانٹس۔۔۔ اے سی۔
"اوہ میرے خدا۔۔۔! بلال بچے۔۔۔ تم نے اتنا خرچ کروا لا۔۔۔۔"
"ارے یہ بتائیں، میری تائی اماں خوش ہیں کہ نہیں۔" وہ انہیں بانہوں میں لیے ان کا منہ چوم رہا تھا۔
"جیتے رہو میرے بچے۔!" تائی اماں کی آنکھیں بھر آئیں۔

☆ ☆ ☆

رات سے ہلکے ہلکے جھکڑ چل رہے تھے۔ صبح صادق ہوئی تو موسم اور زیادہ خوشگوار۔ کالے کالے بادل۔ پر شور ہوا۔ فضا میں قلابازیاں لگاتے پکھیرو۔ لڑکیوں کے تو دل بے قابو ہونے لگے۔
"عائشہ چچی! ناشتے میں پورے۔ پورے صرف پورے۔" پائیں باغ میں نعرے بازی ہو رہی تھی۔
باورچی خانے میں آٹا گوندھنے کے لیے پرتولتی بھنڈی نے آٹے سے بھری پرات یوں ہی ڈرم میں
"اب عائشہ چچی جانیں اور ان کا کام۔" وہ بگٹٹ باغ کی طرف بھاگی کہ کہیں موسم کی رنگینیوں سے محروم نہ رہ جائے۔
وہاں رنگین آنچل لہرائے جا رہے تھے۔ لکن میٹی۔
بول میری مچھلی کتنا پانی۔۔۔ مائی میری مشک کا پانی پی لو۔
تینوں بھابھیاں بھی ننھی منی بنی لڑکیوں کے ساتھ۔
ہی۔۔۔ ہی۔۔۔ ہائیں معروف۔۔۔ رنگین آنچل فضا میں لہرائے جا رہے تھے۔
ڈاکٹر صاحبہ جامن کے درخت پر تھیں۔ کسی کے گال پہ نشان پڑ رہا تھا۔ کسی کی ناک جامنی ہو گئی۔ نشانہ تو بہت ہی بہترین تھا۔
افشین اپنی دودھیا پالتو بلی کو زبردستی سبز گھاس پہ بٹھائے اس کے مختلف پوز لے رہی تھی۔ اوما بلال بھائی کے کندھے سے لٹک رہی تھی۔
"اتنے اچھے موسم کا اس چار دیواری میں کیا مزہ۔ کہیں باہر چلیں۔" بعض معاملات میں صرف بلال بھائی کا ہی سکہ چلتا تھا۔ طلال کے پاس گاڑی نہ تھی۔ اور نہ ہی بزرگوں کی اجازت کے بغیر گاڑی استعمال کی جا سکتی تھی۔ چھوٹے چچا کا ٹیپو ابھی چھوٹا تھا اور شادی شدہ فاران بھائی اتنے سڑیل مزاج کہ اوما مر کر بھی ان سے فرمائش نہ کرتی۔ لے دے کر بلال بھائی ہی بچتے۔
"جاؤ پہلے مرسلین سے اجازت لے کر آؤ۔"
مرسلین اوما سے چھوٹا تھا مگر اسے بگ باس بننے کا شوق تھا۔ بلال بھائی جان بوجھ کر اسے چھیڑ رہے تھے۔
"تو کہہ دیجئے کہ لے جانا نہیں چاہ رہے۔" خضریٰ نے دور سے ہانک لگائی۔
تبھی سنگھاڑے نے آ کر اطلاع کی۔
شیراز حسن اوما کو بلا رہے تھے۔
"تیار رہیے۔ میں بس ابھی آ رہی ہوں۔" وہ بھاگم بھاگ شیراز کے کمرے تک آئی۔ وہ بہت سی کتابوں میں الجھے نظر آ رہے تھے۔
"اوما! لائبریری تک جانا ہو گا۔" انہوں نے فوراً اس کے آنے کا نوٹس لیا تھا۔ گھڑی بھر میں ہی ایک

سامنے کتب مذکور تھیں۔
اس نے زیر لب دہرایا۔
"رومی کو ساتھ لے لو۔ وہ ابھی گھر پہ ہی ہو گا۔"
انہوں نے چھوٹے چچا کے منجھلے بیٹے کا نام لیا۔
"کوشش کرنا۔۔۔ ذرا جلدی آ سکو۔" وہ پوری آنکھیں کھولے اس پہ نظریں جمائے کہہ رہے تھے۔ بند کمرے میں موسم کا احوال انہیں کیا معلوم۔؟
اوما بھی جھٹ پٹ وہ کاغذ اور اپنی مخصوص ڈائری تھامے باہر نکل آئی۔
"میں تمہیں زحمت سے بچا رہی ہوں۔ لیکن اگر موسم زیادہ خراب ہوا تو بس صرف ایک مس کال۔"
وہ آتے آتے رومی کو بتا آئی۔
لائبریری دور کہاں تھی۔ بس پندرہ منٹ کی چہل قدمی اور وہ بھی اتنے آفت موسم میں۔ وہ نہر کنارے کھلے بے تحاشا نارنجی رنگ والے پھولوں کے ساتھ ساتھ چلتی لائبریری تک پہنچ گئی تھی۔ اندر حبس تھا۔ لیکن وہ مستعد ہو چکی تھی۔ کتابوں کا ایک ڈھیر نکال کر وہ ایک مخصوص میز پر جا پہنچی۔ مطلوبہ نکات جمع کرتے کرتے اسے تقریباً ڈھائی گھنٹے لگ چکے تھے۔ لیکن وہ خوش تھی۔ شیراز حسن اس کا کام دیکھ کر یقیناً اسے شاباشی ہی دیتے۔ یہ اس کا معمول تھا۔ سیاست، ثقافت، ادب اس کے پسندیدہ موضوعات تھے۔ کالج کے زمانے میں وہ ان موضوعات پر بلا تکان بولا کرتی تھی۔ شیراز حسن اس کے اس شوق سے بخوبی واقف تھے اور بھرپور فائدہ بھی اٹھاتے تھے۔
خود باہر نکلنے سے کتراتے تھے لہٰذا اسی کو پیغام بھجواتے اور وہ نہایت عرق ریزی سے ان کا من چاہا کام کر کے ان تک پہنچا دیتی۔
اب بھی وہ نہایت شاداں و فرحاں لائبریری سے نکلی تھی۔ ہلکی پھلکی رِم جھِم رِم جھِم کے ساتھ مگریہ ساون بھادوں کی بارش تھی۔ منہ زور۔ باغی دھواں دھار۔ وہ لائبریری کا سیاہ آہنی گیٹ عبور کر چکی تھی۔
ایک پل کے لیے سوچا۔ واپس ہو لے۔ تب ہی
"جلدی کرو۔ جلدی۔"
"ہائیں۔۔۔ ہائیں۔" بارش کی تیز بوچھاڑ میں کسی نے بازو سے گھسیٹ کر گاڑی میں بھی ڈال لیا۔
"یہ تم سب کے سب کہاں؟" ہتھیلیوں سے اپنی آنکھیں مسلیں پھر دلچسپی سے ان سب کو دیکھا۔
"ارسلان، شہزا اور فاطمہ۔" انجومای کے تینوں بچے۔
"شیراز بھائی نے فون کیا تھا۔ فوراً" لائبریری پہنچو۔ ہم نے تو یہ بھی نہیں پوچھا کہ کیوں۔۔۔؟ بس پہنچ گئے لائبریری۔ اور "کیوں؟" تو سامنے ہی کھڑی نظر آ گئیں۔"
فاطمہ اس کی درگت بنی دیکھ کر خوامخواہ ہی دانت نکالے جا رہی تھی۔
اگلے پانچ منٹ میں وہ گھر کے گیٹ پہ تھے۔
یہاں ایک اور حیرانی۔
دونوں گاڑیاں لدی پھندی چلنے کو تیار۔۔۔ کہاں؟
"مدیحہ پھپھو کا فون۔۔۔ شاہ زین۔۔۔ ایئر پورٹ۔۔۔ دھائیں دھائیں برستی بارش میں قریب سے گزرتی گاڑی میں سے کچھ اسی قسم کی آوازیں آئی تھیں۔۔۔ ٹیپو بے چارہ گاڑی کا شیشہ کھولے آدھے سے زیادہ باہر لٹک رہا تھا۔
"تم لوگ جا سکتی ہو تو پھر ہم کیوں نہیں؟" فرح اور ضوبیا گیٹ پہ کھڑی بچ رہی تھیں۔ ان تینوں کو گاڑی میں بیٹھے دیکھا تو دونوں طرف سے دھاوا بول دیا۔
"ارے۔۔۔ رے۔۔۔ ہم تو۔۔۔" اوما چلائی مگر ارسلان بھی آج موڈ میں تھا۔ گاڑی اسٹارٹ کی تھی۔

☆ ☆ ☆

واپسی کا دو گھنٹے کا سفر از حد بور ثابت ہوا تھا۔ لاہور جانا اور پھر مہمان کے بغیر واپس آنا۔ سارا سفر ہی بے کار۔۔۔ جاتے ہوئے جو کھانا پینا، ہلا گلا ہوا۔ ایئر پورٹ پہ جا کر ماند پڑ گیا۔
لڑکیاں سمٹ سمٹا کر گاڑی میں ہی بیٹھی رہیں۔

لڑکوں نے ایر پورٹ کا کونا کونا چھان مارا۔ وہ حضرت شاہ زین۔ اونچے لانبے گھبرو جوان۔ فیس بک پر ہزار بار کے دیکھے ہوئے۔ اب یہاں خدا جانے کون سا ماسک پہن کر آئے۔ کہ کسی سے پہچانے نہ گئے۔ لڑکوں سے تو خوب ہی دوستی تھی۔ گپ شپ۔ مشورے مشاورت۔ سا بجھی دوستیاں۔

مایوس ہو کر گھر کے فون کھڑکائے گئے۔ جو اول تو ریسیو نہ ہوئے اور ہوئے تو حکم ملا کہ۔

"واپس چلے آؤ۔"

"ہائیں۔ ایسے کیسے۔ بنا مہمان ؟" وہ حیران تھے مگر واپس ہو لیے۔ سارا راستہ اونگھتے' سوچتے' کوستے ہوئے گزرا۔

گھر میں داخل ہوئے تو بھنڈی انہیں دیکھ کے ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوئی جا رہی تھی۔ ساتھ دینے کے لیے خضریٰ شانہ بشانہ۔

"شاہ زین بھائی سرپرائز دینا چاہتے تھے۔ مدیحہ پھپھو نے چوری چوری یہاں فون کر دیا۔ شاہ زین بھائی کو کیا خبر۔؟ جہاز سے اترے۔ ٹیکسی کی اور سیدھے یہاں۔ بارش ختم۔ ہوا ختم۔ اور سورج سوا نیزے پر۔ وہ تو جی۔ گرمی اور حبس سے گوڈے گوڈے گھبرا گئے" گوڈے' گوڈے بھنڈی کا تکیہ کلام تھا جو کسی بھی وقت' کسی بھی جگہ فٹ ہو سکتا تھا۔

"پہلے تو کالونی میں گھوم پھر کے گھر ڈھونڈا۔ چکر کھا کھو کے آخر یہاں پہنچے تو آگے سے گنگو ٹکر گیا۔ گنگو بے چارہ کانوں سے بہرہ۔ وہ بولیں۔ یہ سنے نہ۔ وہ پوچھیں تو یہ ہنس دے۔ تنگ آ کر خود ہی مال اسباب اٹھا کر اندر گھس گئے۔ ارم باجی سامنے سے آ رہی تھیں۔ پر ان کو کہاں دکھائی دیں۔ وہاں تو پسینہ گوڈے گوڈے بہہ کر آنکھوں میں گھس رہا تھا۔ خود تو آگے گزر گئے۔ گملا پیچھے لڑھکا دیا۔ اب پتا نہیں لڑھکایا تھا یا لڑھک گیا۔ مگر اپنی ڈاکٹر فی صاحبہ پیر کے انگوٹھے پہ ہلدی' تیل لگا کر پٹی باندھ رہی ہیں۔" وہ دانت نکالتی داستان سناتی رہی۔

لڑکے تو کب کے شاہ زین کے سر پر پہنچ چکے تھے۔

ارم کی مزاج پرسی کی۔ کچھ سونے کے لیے لڑھک گئیں۔ اوما شیراز حسن کے کمرے سے ہو کر اپنے پورشن میں آ گئی تھی۔ سارے دن کی تھکان کے بعد وہ اب کچھ آرام کرنا چاہتی تھی۔

☆ ☆ ☆

"نہ۔ شاہ زین بھائی! آپ کو آخر سوجھی کیا؟ ہم تو کئی دنوں سے بہنوں پہ بتیاں بال رہے تھے کہ شاہ زین آ رہا ہے۔ آ رہا ہے۔ اور آپ آئے بھی تو یوں۔ اور بیچاری ارم آپی کا کیا قصور۔۔۔۔؟ ابھی تک ہلدی۔ تیل۔" یہ خضریٰ تھی۔ اوما اور مرسلین سے چھوٹی دوپہر کے ان دیکھے سانحے کو تخیل کے پردے پہ دیکھ دیکھ کر ہنستی جا رہی تھی۔

شاہ زین بے چارہ شرمندہ سا بیٹھا تھا۔

سب ڈائننگ ہال میں جمع تھے۔ کھانا کھایا جا چکا تھا۔ ایک گھنٹہ تو پورا تایا ابو نے لگایا سب کو متعارف کرانے میں۔ اور اس کے بعد سے نوجوان پارٹی اسے گھیرے بیٹھی تھی۔ شاہ زین غالباً "سترہ" اٹھارہ سال بعد آیا تھا۔ اور فی الحال ذرا چپ چاپ بیٹھا ان کے ماحول کا جائزہ لے رہا تھا۔

سب لوگ عجب رنگوں کے تھے اور ہر رنگ اپنی جگہ منفرد۔ نکھرا ہوا۔ شوخ۔ بات سے بات نکالتے تھے۔ فقرہ ابھی کہنے والے کے منہ میں ہوتا اور باقیوں کی ہنسی اسٹارٹ۔ بہت سی بے تکی باتوں کے درمیان بلال بھائی اچانک بڑی سنجیدگی سے کہتے۔

"میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔"

ساری قوم اپنی بولتی بند کر کے ان کی طرف متوجہ ہو جاتی۔

"کریم والے بسکٹ میں کریم ہوتی ہے لیکن ٹائیگر بسکٹ میں' ٹائیگر نہیں ہوتا۔" ہاہاہا۔

کبھی جھاڑو دیتے سنگھاڑا کو اچک کر لے آتے۔

وہ بھی شوقین مزاج۔ گہری سیاہ رنگت میں سفید دانت لشکارے مارتے تھے۔ شاید اسی لیے سنگھاڑا کہہ

وہ کانوں پہ ہاتھ رکھ کر لمبی تان لگاتا۔

رحمت دا دریا الٰہی!
تے ہر دم وگدا تیرا
جے اک قطرہ بخشے مینوں
تے کم بن جاندا میرا

میاں محمد بخش کلام باہو' ہیرو وارث شاہ۔ چل سو چل۔۔۔۔

مروا کے پھول ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے۔۔ بے آواز۔ چنبیلی مہکنے لگتی۔۔ وہ سب دم بخود بیٹھے رہتے۔

سنگھاڑے کی جوان آواز شام سے کا دکھ روتی۔ کہیں احساس زیاں جگاتی کہیں انجانا دکھ بھر دیتی۔ نوجوان دل تازہ محبتوں کی یاسیت سے رسنے لگتے۔ ہر چہرہ اپنے رنگ پہ آ جاتا۔

ایسے میں شاہ زین حسن ٹکر ٹکر ان کھوئے ہوئے انسانوں کو دیکھتا رہتا۔

☆ ☆ ☆

"چھوٹی چچی پوچھ رہی ہیں۔ چائے کمرے میں پئیں گے یا ہال میں۔"

"نئیں یار۔! ابھی کچھ سونے کا موڈ ہے۔ چائے کچھ دیر کے بعد۔" شاہ زین سنگھاڑے کو ٹال کر بیڈ تک آیا۔

"بڑی چچی نے کہا ہے۔ چائے دم پہ رکھی ہے۔ ابھی بھجوا دیں یا۔۔؟"

سر جھانک رہا تھا۔

"پلیز۔ ابھی تھوڑی دیر بعد۔ میں کچھ ریسٹ چاہ رہا تھا۔"

شاہ زین نے قدرے ندامت سے دوبارہ انکار کیا۔ وہ آج صبح سے مختلف ہاؤسنگ کالونیوں کا جائزہ لینے کے بعد کچھ دیر قبل ہی گھر لوٹا تھا۔

تھوڑی بعد دروازے پر ایک بار پھر کھٹر پٹر ہوئی۔

"چائے کچھ دیر بعد۔" اس نے نعرہ لگایا اور تکیہ

"ہائیں۔" اس نے تکیے کے نیچے سے جھانکا۔

تائی اماں بے چاری دبے پاؤں واپس لوٹ رہی تھیں۔ وہ ایک جست لگا کر ان تک پہنچا۔

"آئیے۔ آئیے۔ سوری۔ معذرت۔ میں سمجھا۔" اس نے انہیں کندھے سے تھاما اپنے پاس لا بٹھایا۔

"تم شاید آرام کر رہے تھے۔؟" بڑا بیٹھا لہجہ تھا۔

"نہیں جی۔ میری کیا مجال۔؟ مم۔ میرا مطلب ہے' آپ نے آنے کی تکلیف کیوں کی ممانی جان! مجھے بلوا لیا ہوتا۔"

"جیتے رہو۔ جیتے رہو۔ میں تو بس تم سے کچھ باتیں۔" اور پھر باتیں شروع۔ وہ بھی تائی اماں کی۔

شاہ زین جمائیاں روکنے کی کوشش میں ہلکان۔۔۔ آنکھوں میں نیند کی سرخی لیے۔ وہ ان کی باتیں سن رہا تھا اور سنے جا رہا تھا۔

سب باتوں کی ایک ہی بات۔

"مغربی لڑکیوں کی خرابیاں اور ان سے دوستی کے نقصانات۔"

معلوم نہیں اتنے نکات کہاں سے جمع کیے تھے انہوں نے — ہاں بھئی۔ بیٹا لکھاری' صحافی۔ تو اماں پر بھی کچھ تو اثر ہونا ہی تھا ناں۔

"شاہ بیٹا! کہیں تم نے تو وہاں کی لڑکی سے۔۔ کوئی چکر وکر تو نہیں چلا رکھا۔ میرا مطلب ہے۔ یہ دوستیاں وغیرہ۔"

"جی؟ لڑکیوں سے دوستی۔۔" وہ کہتے کہتے ایک دم رکا۔

تائی اماں کی آنکھوں میں سو خدشے' وہم' خوف سر سرا رہے تھے۔ شاہ زین کو فوری طور پر اپنے جواب میں ترمیم کرنا پڑی۔ اقرار کی صورت میں تو بچے ادھڑنے کا ڈر تھا۔

"نہیں نہیں۔ ہرگز نہیں۔ لڑکیوں سے دوستی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں ایک پاکستانی گھرانے کا چشم و چراغ۔ میں اور ایسی حرکت۔ توبہ۔ توبہ۔۔۔" اس

زیادہ بول دیا ہے۔ سر کو دو چار بار جھٹکا۔ اف خدایا۔
"یہ فضا کا اثر ہے یا ماحول کا۔ نیند کے سامنے ایسی بے بسی کبھی محسوس نہ ہوئی تھی۔ شاید یہاں کی خوراک۔
تائی اماں نے بھی غالباً" اس کی کیفیت محسوس کرلی تھی۔ سو اسے آرام کرنے کا کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔
پھر جاتے جاتے پلٹیں۔
"میں نے کہا اگر چائے۔"
"ضرور... کیوں نہیں۔ چائے بھجوادیں۔ اشد ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔"
اور کچھ ہی دیر بعد۔ ڈھیر سارے لوازمات کے ساتھ چائے پیتے ہوئے اس نے بہت سوچا مگر یاد نہ آسکا کہ وہ کس ریاست کا نواب تھا۔

☼ ☼ ☼

یہ بڑی سی میز تھی اور انواع و اقسام کے کھانوں سے پر۔
رات کے کھانے کا وقت تھا۔
ٹیپو کی آنکھیں حیرت کے مارے کھل گئیں اور رومی کا منہ۔
"یا الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے؟" رومی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے سے پوچھا۔
"کچھ پڑھ کے پھونک رہے ہیں کھانے پر۔ سب کے ہاتھ کیوں بندھے ہوئے ہیں۔؟" ٹیپو نے سرگوشی کی۔
"شاہ بھیا کا انتظار ہے۔ آدھ گھنٹہ قبل پیغام آیا تھا۔" آرہا ہوں۔"
اب معلوم نہیں۔ کہیں بھول بھلیوں میں کھو گئے۔ یا چھکڑے پہ بیٹھ کر آرہے ہیں۔"
"اوہ۔" رومی نے کھانے کی میز پر نظر دوڑائی۔
"ہم لوگ شروع کرتے ہیں ناں... وہ بھی۔"
"ناں... ناں" تینوں خواتین یک لخت ہی چلائیں۔
ٹیپو بے چارے کے ہاتھ سے چمچ چھوٹ کر دور شروع ہو گیا ہمارے ہاں! انتظار کرو۔ جیسے سب لوگ کر رہے ہیں۔"
ٹیپو نے جھاڑ کھائی اور پھر اپنا سا منہ لے کر بیٹھ رہا۔ کیونکہ وہاں سب ہی اپنا اپنا منہ لے کر بیٹھے تھے۔
ادھر شاہ زین صاحب گہری نیند سے بیدار ہو کر نہائے' دھوئے' بال بنائے۔ سیڑھیوں سے نیچے اترے تو جدھر کچھ آوازیں آئیں' ادھر کو ہو لیے۔ ابھی یہاں آئے ہوئے جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہ ہوئے تھے۔ نہ ہی سارا گھر گھومے پھرے تھے۔ پھر سب ہی پورشن ایک سے۔ ہاں چھوٹا سا کوریڈور عبور کر کے بائیں جانب مڑے تو ماحول میں کچھ اجنبیت سی محسوس ہوئی۔
یہاں رات کی رانی اور چمپا کے ساتھ ساتھ مولسری کی خوشبو فضا میں حاوی تھی۔ ایک کمرے کی جالی دار کھڑکی سے روشنی چھن چھن کر باہر آرہی تھی۔ وہ اسی کمرے میں جا گھسے۔ یہاں بھی ماحول مختلف۔ کہاں تو کھانے کے لیے پیغام پہ پیغام آرہے تھے اور کہاں کھانے کا نام و نشان بھی نہیں۔ جنگ و جدل اور چیخم دھاڑ اپنے وہی تھی جو اس گھر کے ہر اس مقام پر دکھائی دیتی تھی جہاں دو یا دو سے زیادہ افراد پائے جاتے تھے۔
"میرا جینا محال' سونا دشوار' حال بے حال ہو چکا ہے۔ ایک الماری پہ چھپکلی چپکی ہوئی ہے۔ دوسری پہ مکڑی لٹک رہی ہے۔ دراز پہ چھوریگ رہا ہے۔ میرے اللہ! اس کمرے میں کسی انسان کے رہنے کی کوئی گنجائش نہیں۔" وہ لڑکی سخت خفا انداز میں بول رہی تھی۔ جبکہ دوسری گھٹنوں پہ ٹھوڑی ٹکائے کھی کھی کیے جارہی تھی۔
"اس سے زیادہ گھٹیا اور بے ہودہ شوق شاید ہی کوئی ہو گا۔ کل دراز سے ڈسپرین ڈھونڈتے ہوئے وہ کم بخت لال بیگ میرے ہاتھ سے ہی چپک کر رہ گیا۔ امی آپ فوراً" سے پیشتر میرے لیے کسی دوسرے کمرے

"اوہ تو یہ معاملہ ہے۔" شاہ زین نے اب سمجھا تھا۔ ماحول گرم کیوں ہے۔ امی بے چاری نے دونوں ہاتھوں میں تھاما ہوا سر اٹھایا۔ تو شاہ زین نے عائشہ چچی کو پہچانا۔
دروازے پہ ہلکی سی دستک دے کر وہ کمرے میں داخل ہوا۔
تینوں نفوش نے اجنبی دستک پر چونک کر دیکھا۔
چچی کے چہرے پہ ہلکی سی ندامت ابھری۔
"کب سے فضول بکے جارہی تھی۔ خدا جانے کیا کچھ سنا ہو گا اس نے۔"
ماں کی آنکھوں میں ہلکی سی تنبیہہ ابھری۔ بیٹی نے غیر محسوس انداز میں کندھے اچکا کر اپنی بے پروائی ظاہر کی اور پھر اسے اندر آنے کی دعوت دینے لگی۔
"سوری۔ یہاں شاید کوئی اور معاملہ چل رہا ہے۔ یا پھر میں ہی غلط وقت پر آیا ہوں۔"
"ارے نہیں بیٹا! کوئی معاملہ نہیں۔ بس ان دونوں بہنوں کے آپس کے جھگڑے۔ آؤ۔ بیٹھو۔" عائشہ چچی نے فوراً" اس کے لیے جگہ کشادہ کی۔
"کیا لو گے بیٹا۔ چائے۔ ٹھنڈا۔ یا کھانا لگوادوں؟"
وہ کچھ تذبذب کے عالم میں تھا۔ مگر بہر حال بیٹھ گیا۔
"کہاں تو بھنڈی نے کھانے کے لیے دروازہ بجا بجا کر توڑ دیا۔ اور اب پوچھا جارہا ہے کہ... اور باقی اہل خانہ...؟"
عائشہ چچی ادھر ادھر کی چھوٹی چھوٹی باتیں کرنے میں مصروف ہو گئیں۔
وہ الجھا سلجھا جواب دیتا رہا۔
اسے تو یہ ہی معلوم تھا کہ کھانے کے وقت تمام اہل خانہ موجود ہوتے ہیں۔ یہ اور بات کہ اجتماعی کھانا کھانے کی نوبت ابھی تک کم ہی آئی تھی۔
اور اسی دیر میں تلی ہوئی مچھلی' کباب اور ابلے چاول اس کے سامنے تھے۔ تھوڑی دیر میں تازہ تڑکا لگی دال لے پاس بھی لیٹر لیٹر باتیں کیے جارہی تھی۔ اور یہ کوئی اضافی خوبی نہ تھی۔ سارا خاندان ہی باتونی تھا' یہ شاہ زین کو آتے ہی معلوم ہو گیا تھا۔
"آپ تو بہت جنٹل مین بنتے ہیں۔ مم میرا مطلب "ہیں" بہت ہی بیے بچے ہیں بیے کا مطلب سمجھتے ہیں آپ... آں۔ اوا ذرا بیے کی انگریزی تو بتانا۔" وہ بیچ میں ہی پکارتی پھر دوبارہ گفتگو کا سلسلہ جوڑتی۔
"آپ ذرا اپنے گھر بار کے چکروں سے نکل آیئے۔ پھر آپ سے چٹ پٹی سنیں گے۔"
"خضریٰ! اٹھو اور چائے بنا کر لاؤ۔" عائشہ چچی نے اسے اٹھادیا۔ تو شاہ زین نے پہلی بار ڈھنگ سے کھانے کی طرف توجہ دی۔
کھانے کے بعد چائے۔ اسی دوران مرسلین کی آمد ہوئی۔ وہ ایم بی اے کے آخری سال میں تھا۔
سنجیدہ مزاج نوجوان۔ گفتگو بھی خاصی سلجھی ہوئی۔
چائے کے دوران خاصی اچھی گپ شپ رہی دونوں کی۔ بعد ازاں وہ اجازت لے کر باہر نکل گیا۔ کھانے کے بعد چہل قدمی کی عادت تھی اس کو۔

☼ ☼ ☼

اگلا روز خاصی گرما گرمی لیے ہوئے تھا۔ چھوٹی' بڑی چچی کے بڑے بڑے منہ پھول' سوج کر اور بھی بڑے ہو چکے تھے۔
"یہ زیادتی ہے بڑی بھابھی! ہم لوگ بیس' بیس کھانے بنائے منتظر۔ سارے بچے بھوکے انتظار کرتے رہے اور وہ محترمہ اسے گھٹنے سے لگائے دال' چاول کھلاتی رہیں۔
تائی اماں نے خاموشی سے ان کا شکوہ سنا تھا۔
عائشہ بڑی سادگی سے اپنی صفائی پیش کر گئی تھیں اور تائی اماں رہیں سدا کی منصف۔ انہیں کہیں سے بھی عائشہ چچی قصوروار نظر نہ آئیں۔ سو انہوں نے بات وہیں پہ ٹھپ کردی۔ لیکن بگڑے ہوئے موڈ سنور نہ سکے۔

چہروں کے بگڑے ہوئے زاویے۔ روکھا پھیکا' سرد ماحول۔

"یہ کیا ہو گیا ان لوگوں کو۔۔۔؟" شاہ زین سر کھجاتا۔ بددلی سے ممانیوں کو دیکھتا رہا۔ بھید تو تب کھلا۔۔۔ جب بھنڈی اس کے دھلے ہوئے کپڑے لے کر کمرے تک آئی۔

"رات آپ نے اچھا نہیں کیا۔ سارا ٹبر گوڈے گوڈے بھوکا بیٹھا رہا اور آپ مزے سے مچھلی کباب کھا یہ جا وہ جا۔"

شازہ زین یک لخت ہی چوکس ہو کر اٹھ بیٹھا۔ اور پھر کرید کرید کر بھنڈی سے پوچھتا اور گرہیں کھولتا رہا۔

"عائشہ چچی کا پورشن الگ تھلگ کیوں؟ کھانے میں اس گھرانے کی شمولیت کیوں نہیں؟ اور کھانا "ادھر" سے کھا لینے پر اتنی ناراضی کیوں؟"

بھنڈی نے ہزاروں قسمیں دے کر اپنا نام صیغہ راز میں رکھتے ہوئے بتایا۔

"وحید چاچو باقی بھائیوں کے سوتیلے بھائی ہیں۔ اس پر مستزاد' شادی بھی زور زبردستی اپنی پسند سے کروائی عائشہ چچی سے۔ گھر والوں کا سلوک وحید چاچو سے کبھی بھی اچھا نہ رہا۔ لہٰذا وہ آج سے کئی برس قبل دل برداشتہ ہو کر دبئی چلے گئے۔ بیوی' بچوں کو بلانے کے لیے راضی نہیں ہوئے' خود البتہ کبھی کبھار چکر لگا لیتے ہیں۔ بچے تو آپس میں شیر و شکر ہیں۔ اور بڑے بھی بظاہر تو ٹھیک ہیں لیکن سوتیلے پن کی گرہیں کبھی نہیں کھلتیں۔" یہ آخری نادر خیالات بھنڈی کے اپنے تھے جن کا اظہار کیے بغیر وہ نہیں رہ سکتی تھی۔

شاہ زین کو البتہ حیرت تھی کہ اس کی ماں نے کبھی بھی اپنی خاندانی پس منظر کو اس سے ڈسکس نہیں کیا تھا۔ شاید آج تک ان دونوں ماں بیٹوں کو اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔

☆ ☆ ☆

کل ہی ارم نے سب لڑکیوں کے وزن کیے تھے اور چلائی رہ گئیں۔

"بھابھیوں میں سے کسی کو ساتھ لے لو۔ ارے اکیلی جاؤ گی کیا۔۔؟ تمہارے تایا' چچا۔" اتنے میں منہ زور لڑکیاں کھٹ کھٹ کرتی گیٹ سے باہر۔

"ہماری ماؤں کے ذہن نہیں بدلے جا سکتے۔ لڑکیاں آٹھ دس بھی ہوں تو اکیلی۔" وہ بڑے مزے سے گپیں ہانکتی ساری کالونی کے چکر لگاتی رہیں۔ تازہ ہوا نے سب ہی کے مزاجوں پر خاصا خوشگوار اثر ڈالا تھا۔ بات بے بات ہنستی قہقہے لگاتی واپس آ کر تائی اماں کے سامنے کھڑی ہو گئیں۔

"دیکھ لیجئے۔ سب کی سب صحیح سلامت واپس۔ اپنا محلہ' اپنے لوگ پھر کاہے کا ڈر۔"

ان کا روز کا معمول بن گیا۔ تایا' چچا' بلال' فاران بھائی اس وقت تک گھر پہ نہیں آتے تھے۔ لہٰذا اس معمول میں کوئی مخل نہ ہوا۔

الٹا بڑی چچی نے بھی حمایت کی۔ "اچھا ہے گھڑی بھر کے لیے تازہ ہوا میں گھوم پھر آئیں۔ اسکول کالجز کے بعد سارا دن گھر میں بند ہی تو رہتی ہیں۔"

لیکن پھر اس معمول کو کسی اور نے بھی نوٹ کر لیا تھا۔

شب بارات کی آمد آمد تھی۔ اور چھوٹے موٹے پٹاخے رات کو ادھر ادھر چھوٹتے ہی رہتے تھے۔ وہ اپنی باتوں میں مگن تیز تیز قدم اٹھاتی معمول کے راستوں پر رواں دواں تھیں۔ جب ایک موڑ مڑتے ہی یکا یک پانچ سات پٹاخے عین ان کے قدموں میں آ گرے چھوٹے۔ ان سب کی تیز چیخوں نے کالونی کے در و دیوار کو ایک پل کے لیے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

کوئی آنکھوں پہ ہاتھ رکھے چیخ رہی تھی۔ کوئی کانوں پہ۔ ضویا تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اور خضریٰ نے با آواز بلند رونا شروع کر دیا تھا۔

وہ تین لڑکے تھے۔ جو اس شرارت یا بد تمیزی کے بعد سامنے قطار میں بنی کوٹھیوں میں سے کسی ایک کے اندر گھس گئے تھے اور اب غالباً "یہ تماشا دیکھ کر محظوظ

حال میں ذرا جلدی بحال ہو جاتے تھے اس نے کسی کو ہاتھ سے پکڑا۔ کسی کو بازو سے کھینچا۔ کسی کا پلو دبوچا اور اس سے قبل کہ آس پاس کے گھروں سے لوگ باہر نکلتے۔ وہ ان سب کو لے کر برابر کی پتلی سی گلی میں گھس گئی تھی۔

"یہ تم اپنا باجا تو بند کرو۔ گھر والوں کو ذرا سی بھنک پڑ گئی اس بات کی تو وہ بے عزتی ہو گی کہ یاد ہی کرو گی۔ اب چپ کر کے نکلو ادھر سے تاکہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔"

بات تو سچ تھی۔ وہ دم سادھے چلیں تو گھر کے گیٹ پر ہی جا کر دم لیا۔

نیچے رکنے میں خطرہ تھا۔ وہ دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلی آئیں ذرا دیر میں ہی چھت پہ ایک دائرے میں بیٹھی تھیں سر تھامے۔

"شکر کرو کہ آج بھنڈی ساتھ نہیں تھی۔ ورنہ وہ ڈھول ابھی تک بج رہا ہوتا۔" تائی اماں نے کسی خاص ڈش کی تیاری کے لیے اسے گھر پر ہی روک لیا تھا۔

ناک اور آنکھوں میں ابھی تک دھواں گھسا ہوا۔

"میرے پیروں پر جلن ہو رہی ہے۔ لگتا ہے جل گئے ہیں۔ ارم! کہیں نشان ہی نہ بن جائیں۔" فرح از حد فکر مند تھی۔

"شاہ زین کا کمرہ خالی ہے۔ وہاں چل کر دیکھ لیتے ہیں۔" ارم دل ہی دل میں شرمندہ ہو رہی تھی۔

"ناحق بے چاریوں کو ساتھ لے کر خوار کرتی رہی۔"

شاہ زین معمول کے مطابق اس وقت باہر گیا ہوا تھا۔ اس لیے وہ سب آزادی سے اس کے بیڈ پر ڈیرا ڈال کر بیٹھ گئیں۔۔۔ کسی نے صوفہ سنبھال لیا۔

اریبہ اس وقت سب سے معقول دکھائی دے رہی تھی لہٰذا اسے نیچے بھجوا دیا گیا۔

"تائی اماں کو کہہ دینا کہ ہم سب شیراز بھائی کے کمرے میں ہیں۔" بہانہ بتا کر روانہ کر دیا گیا۔

آنکھوں میں خوف کچھ کچھ غصہ۔

اوما کے لبوں سے ہنسی ایک فوارے کی صورت میں چھوٹی تھی۔ اور پھر یکے بعد دیگرے سب کے قہقہے نکل گئے۔

"اوئی امی جی۔" خضریٰ کی نقل اتاری گئی۔

"ہائے میں مر گئی۔ ہائے میں مر گئی کہہ کر ڈانس کون کر رہا تھا۔" فرح کو چھیڑا گیا۔

"اف خدایا! لگتا ہے ایک پٹاخہ افشین کے بالوں میں چھوٹا تھا۔" اس کے گھونگھریالے بال بے تحاشا بکھرے پڑے تھے۔

"اتنے دنوں کی واک نے بھی کوئی اثر نہیں ڈالا۔ موٹیوں کو کھینچ کھینچ کر کے میرے نازک بازو جواب ہی دے گئے۔ اف خدایا! میں کتنی ذہین واقع ہوئی ہوں۔ اگر بروقت تم لوگوں کو وہاں سے نکال کر نہ لے آتی تو ابھی تک ہم وہاں لوگوں کے نرغے میں پھنسے ہوتے۔ اور اس کے بعد تایا' چچاؤں کی پیشیاں بھگت رہے ہوتے۔"

"یہ سب کیوں ہوا؟"

"کیسے ہوا؟"

"کس نے کیا؟"

"کس کی اجازت سے ہوا۔؟" اوما ناک پر عینک جمائے۔ بالکل تایا ابو ہی لگ رہی تھی۔

"ہاں تو پھر بتائیں ناں۔ کیا' کیوں' کب اور کیسے۔؟ کوئی اس کے عین سامنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے کھڑا تھا۔

"اوئی ماں' آپ کہاں سے نکل آئے؟"

اوما نے گڑبڑا کر سکھیوں کو دیکھا۔

"شاہ صاحب! میرا مطلب ہے شاہ زین بھیا! آپ تو اس وقت۔۔۔؟"

"باہر نہیں ہوتا۔ آج شہزادیاں محل میں وقت سے بہت پہلے پہنچ گئیں۔ اور ظاہر ہے کہ خیریت نہیں رہی۔۔۔ چہروں سے تو یہ ہی لگ رہا ہے اور باقی باتیں بھی

اتفاق سے ٹیرس پر کھڑے ہوئے تھے
گیا۔ وہ آپ بتائیے۔" اب بھاگنے کی گنجائش کہاں تھی۔ اوما نے مختصر بتادیا۔

"اب آپ کسی اور سے نہ کہہ دیجیے گا۔ مرد حضرات سارے کے سارے تائی پچیسوں پہ چڑھ دوڑیں گے کہ ہمیں گھر سے نکلنے ہی کیوں دیا؟"

"ٹھیک ہے نہیں کہوں گا۔ لیکن جانے سے پہلے بیڈ شیٹ جھاڑ کر درست کر دیجیے گا۔ صوفے کے کشن ترتیب سے اور کارپٹ پر ڈسٹنگ بھی اصل میں ڈسٹ مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔" وہ نہایت اطمینان سے کہہ کر باہر نکل گیا۔

"ہائیں۔" لڑکیوں کو قدرے حیرت ہوئی۔ پھر جھک جھک کر پہلو بدل بدل کر دیکھا جانے کن کن راستوں سے واپس ہوئی تھی۔ سب کے پیر دھول مٹی سے اٹے ہوئے تھے۔

"یہ بھی بڑی چیز ہیں۔ رفتہ رفتہ کھلیں گے۔" فرح نے پرسوچ نظروں سے شاہ زین کی سائیڈ ٹیبل پر رکھی تصویر کو دیکھ کر کہا تھا۔

اگلی شام کا وہ لمحہ ان سب لڑکیوں کو حیران کر دینے والا تھا۔ جب شاہ زیب اور طلال ان کے سامنے کھڑے کہہ رہے تھے۔

"واک کرنے کون کون جارہا ہے؟"

چند لمحے آنکھوں ہی آنکھوں میں مشاورت کے بعد اوما سب سے پہلے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ پھر یکے بعد دیگرے۔ باقی سب۔

طلال نے جاتے جاتے مرسلین کو آواز لگائی۔ مرسلین نکلا تو روی اور ٹیپو بھی ساتھ ہولیے تھے۔

☆ ☆ ☆

شاہ زین نے بنا بنایا گھر خرید لیا تھا۔ وہ سب کے سب مل کر گھر دیکھنے کے لیے گئے۔ "حاوی" کی ڈیزائننگ نے سارے شہر میں دھوم مچا رکھی تھی۔ اور یہ گھر بھی ان ہی کا ڈیزائن کیا گیا تھا۔ قدیم و جدید کا امتزاج۔ وسیع و عریض لان کے داہنی جانب ایک

"شاہ زین بھائی! فوراً" سے پیشتر ہی تو بلوائیے۔ انار اور لیموں کے درخت ہونے چاہئیں بلکہ انار کا درخت اس طرح ہو کہ اس کی شاخیں بڑھ کر حوض کے پانی میں اپنا عکس دکھائیں۔ اور جب میں یہاں آیا کروں گی ناں تو حوض کنارے بیٹھ کر "اداس نسلیں" اور "آنگن" پڑھا کروں گی۔" اوما اپنی رائے کے اظہار اور مفت مشورے دینے میں کبھی کنجوسی نہیں کرتی تھی۔

"حوض میں سفید بطخیں ہونی چاہئیں۔ یہ مطالبہ بھی پیش کردو۔" فرح نے ہلکا سا طنز کیا۔

"وہ کمی تو تمہارے آنے سے پوری ہوجایا کرے گی۔" اوما کے بجائے ضویا نے جواب دیا۔

"اور یہاں پر ایک بک شیلف ہونا چاہیے۔ اور ادھر گلاس وال کے بائیں جانب اسٹریو پڑا ہو۔ تاکہ برستی ہوئی بارش میں یہاں بیٹھ کر جگجت' نور جہاں اور نصرت فتح علی خان کی غزلیں سنی جاسکیں۔" اوما کے لہجے میں جو بات سب سے پہلے محسوس کی جاسکتی تھی' وہ اس کا کھرا پن تھا۔ کسی بھی کھوٹ' بناوٹ سے عاری' صاف ستھرا لب و لہجہ۔ جس سے کسی بھی "جذبے" کو اخذ نہیں کیا جاسکتا تھا۔

شاہ زین بے حد دلچسپی اور شوق سے اسے سن رہا تھا۔

اور ایسے ہی جذبے اور لگن میں چوبی زینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بے اختیار اس کے منہ سے نکلا تھا۔

"اگر یہ میرا گھر ہوتا۔ تو میں یہاں۔"

تو شاہ زین نے فرح اور اریبہ کے ساتھ افشین کے چہروں کے بگڑے زاویوں کو بخوبی محسوس کیا تھا۔

"بلی کو چھچھڑوں کے خواب۔" کسی نے ہلکی سر گوشی کی۔ اور پھر بلند قہقہہ۔

اوما نے قدرے چونک کر ان سب کو دیکھا۔ اس کا دھیان بٹانے کی لاشعوری کوشش کے طور پر شاہ زین نے اسے زینے سے اوپر جانے کی پیشکش کی لیکن وہ اوما تھی۔ ان ہی لوگوں میں پیدا ہوئی۔ ان ہی میں پل کر

اور کس مفہوم میں کہا گیا۔؟

شاہ زین نے اس کے چہرے کا رنگ ایک پل کے لیے بدلتا محسوس کیا مگر دوسرے لمحے وہ بالکل نارمل ہوچکی تھی۔

"میں صرف اپنا بیڈ روم ڈیکوریٹ کررہا ہوں۔ باقی سب کام والدہ محترمہ خود آکر کریں گی۔ میری اور ان کی چوائس بہت ڈفرنٹ ہے۔" شاہ زین کہہ رہا تھا۔

"ان کا انتظار کیوں۔ آپ اوما سے ہیلپ لے لیں۔ یہ بہترین ہوم ڈیکوریٹر ثابت ہوگی۔" کہنے والی نے جانے کس انداز سے کہا تھا لیکن اوما نے نہایت خوش دلی سے جواب دیا تھا۔

"ہاں ضرور۔ کیوں نہیں۔"

☆ ☆ ☆

شعبان المعظم کا آخری عشرہ شروع ہونے کی دیر تھی کہ تائی اماں سستی و بیماری کے سارے چولے اتار' رمضان المبارک کی تیاریوں کے لیے ہٹی کٹی ہو بیٹھیں۔ بند پیٹی کھلوائی گئی جو سال کے سال بس رمضان المبارک میں ہی کھلتی تھی۔ فنائل کی خوشبو میں ڈوبے تکیے' چادریں' کشن نکالے گئے۔ سفید چادریں ایک بار پھر نیم گرم پانی میں ڈبو ڈبو کر نکالی گئیں۔

ہال کمرہ جہاں سارے زمانے کے لڑکے' لڑکیاں' بچے اپنا اپنا اودھم مچائے رکھتے تھے خالی کرالیا گیا۔ سنگھاڑے نے خوب ہی رگڑ رگڑ کر فرش دھویا۔ فنائل میں بھگو بھگو کر پوچے مارے۔ الماریاں صاف کی گئیں۔ یہاں قرآن پاک' سپارے' تسبیحیں' جائے نماز کھجور کی گٹھلیوں سے بھرے پیالے' عطر' اگربتیاں سج گئیں۔ دیوار سے دیوار تک صاف ستھرا دبیز قالین سج گیا۔ چادریں' تکیے' کشن عین وقت پر رکھے جانے تھے۔ لیجیے یہ کمرہ عبادت کے لیے تیار۔ اب مہینہ بھر گھر کی عورتیں یہیں نماز باجماعت ادا کریں گی یہیں تراویح ہوں گی۔ ماہ رمضان میں بچوں کو ادھر ادھر کہیں

انہیں اپنی نگرانی میں بٹھا لیتیں اور وہ نہایت شوق سے کھجور کی گٹھلیاں لے کر ذکر واذکار میں مصروف رہتے۔

باورچی خانے کا انتظام عائشہ چچی کے سپرد تھا۔ وہ سودا سلف لانے کے لیے ایک ایک کو پکڑتیں۔ اس بار شاہ زین نے انہیں فکر مند دیکھا تو مزے سے انہیں گاڑی میں بٹھا کر یہ جا' وہ جا۔ لڑکوں کا خیال تھا کہ جب موصوف ادھ موئے ہوکر لوٹیں گے تو ان کی خوب ہی درگت بنائی جائے گی۔ مگر خلاف توقع شاہ زین خاصا ہشاش بشاش واپس آیا تھا۔ اس کے لیے یہ تیاریاں نئی مگر بہت دلچسپ ثابت ہورہی تھیں۔

اوما نے دو دن سے اپنی شکل نہ دکھائی تھی۔ سحری اور افطاری کی ابتدائی تیاریاں لڑکیوں کے ذمے تھیں اور لڑکیوں میں سے اوما کو باورچی خانے سے اس قدر لگاؤ تھا کہ باقیوں کی بس چھٹی۔

"دہی بڑوں کے لیے ماش اور مونگ کی دال پسوا کر رکھ لی ہے۔ کباب تیار ہوکر فریزر میں پہنچ گئے۔ میکرونیز اور چکن رول کا مصالحہ تیار۔ املی کی چٹنی بن گئی۔ کیچپ بازار سے آگیا۔ اب اگر کسی اور چیز کے لیے کسی کو تکلیف ہو تو وہ خود ہاتھ پیر ہلا سکتا ہے۔"

پہلے روزے سے دو دن قبل نماز مغرب کے فوراً" بعد اعلان کرتے ہوئے وہ دھپ سے فرح کے بیڈ پہ جا گری تھی۔

"ہائیں۔ آپ کے ہاتھ پاؤں اسی میں جواب دے گئے کیا؟" حیرت بھری آواز پر وہ سٹپٹا کر اٹھی۔

شاہ زین مناسب جگہ نہ ملنے پر کونے کے اسٹول پر اٹکا ہوا تھا۔ ٹانگیں البتہ طلال کی گود میں تھیں۔

"ارے آپ بھی یہیں پائے جاتے ہیں۔۔۔" اس نے غیر محسوس انداز میں دوپٹہ کھینچ کر پھیلایا جو آتے کے ساتھ ہی بیڈ پر اچھال دیا تھا۔

"جی ہاں! خوش قسمتی سے یہاں چھوٹے' بڑے سب ہی پائے' پائے جاتے ہیں۔" طلال نے فقرہ بنایا۔۔۔ شاہ زین کا قہقہہ۔

"اور آپ کی اس بات کا کیا مطلب ہوا بھلا؟" وہ سیدھی ہو بیٹھی۔

"ڈیڑھ' دو سو کباب کا قیمہ پیس کر اور پھر کباب بنا کر دکھایئے تو مانیں۔ اتنی ڈھیر ساری تو سبزیاں ہی کافی ہیں۔ بند گوبھی سمیت۔"

"یار طلال! یہ پاکستانی لڑکیاں کتنی نازک ہوتی ہیں۔" نہایت ترحم آمیز لہجے میں کہا گیا تھا۔

جواب کسی اور طرف سے آیا تھا۔

"بس جی کیا کریں۔ پاکستانی جو ہوئے۔ ہماری قومی و نسلی خصوصیت ہے۔ نازک مزاجی اور آرام طلبی۔ ہم بیس بائیس برس انگریز کے ملک میں گزار کر بھی پاکستانی ہی رہتے ہیں۔ لوٹ کر آئیں تو یہ خصوصیات تمہیں نہ کہیں سے عود کر آتی ہیں پھر ہم جوتے سنگھاڑے سے رگڑواتے ہیں۔ رومال' جرابیں گنگو کے سر پہ دے مارتے ہیں۔ ناشتہ بارہ بجے اپنے موڈ کے مطابق بنواتے ہیں۔ دوپہر کے کھانے اور شام کی چائے کے لیے چچی" مائیوں کی دوڑیں لگواتے ہیں اور رات گئے تک گھر بھر کو کھانے کی میز پہ انتظار کرواتے ہیں۔ اور پھر کوئی سچی بات کہے تو برداشت بھی نہیں کر سکتے اور نیلے پیلے' لال ہونے لگتے ہیں۔ کیونکہ ہم پاکستانی ہیں اور پاکستانی تو ہوتے ہی نازک مزاج ہیں۔"

شاہ زین کو تو خدا جانے سانس بھی آ رہی تھی کہ نہیں۔ وہ خود البتہ کہہ کر ہنستی ہوئی کمرے کا دروازہ پار کر گئی۔

کمرے میں بیٹھے نفوس نے بڑی دیر بعد اپنی رکی ہوئی سانس خارج کی۔ حواس و قیاس بحال کیے پھر پلٹ کر شاہ زین کو دیکھا۔

"ارے... ارے... وہ تو بس یونہی۔" شاہ زین کو لب بھینچے اپنی جگہ سے اٹھتے دیکھ کر لڑکیاں اپنی جگہ بوکھلائیں۔

طلال اور ٹیپو منہ چھپائے ہنسی روک رہے تھے۔ شاہ زین دھپ دھپ زمین پہ پاؤں مارتے کمرے سے باہر نکل گیا۔

"کتنی بدتمیز ہے یہ اوما..." فرح کا دل اس قدر دکھا کہ بس رونے والی ہی ہوئی۔ کسی بھی خوبصورت اور ڈیشنگ بندے کی اس قدر بے عزتی کم از کم اس کی برداشت سے باہر تھی۔ خصوصاً" اس وقت جب وہ بندہ کنوارہ ہو اور رشتے کی تلاش میں بھی ہو۔

"حد کر دی بھئی۔ یہ کوئی طریقہ ہے بات کرنے کا۔" یہ اریبہ تھی۔

"زیادہ ہی بددماغ اور بدمزاج ہے یہ لڑکی۔" ایک اور رائے۔

"وہ مہمان ہے اس گھر میں۔ اسے اتنی اجازت کس نے دی ہے کہ..."

اور بس۔ بات کمرے سے نکل کر برآمدے تک... برآمدے سے باورچی خانے... اور یہاں سے کھڑکی پھلانگ کر سیدھی عائشہ چچی تک۔

پھر جو اوما کی مزاج پرسی ہوئی۔ وہ پہلے تو ہکا بکا رہ گئی۔ پھر ہکلائی' منمنائی اور آخیر میں غصے میں آ گئی۔

"یہ ایک انتہائی معمولی سی بات ہے اور اسے اتنا بڑھاوا دینے کی قطعاً" ضرورت نہیں۔" مگر اس وقت تو امی کے اندر تائی' چچیوں کی روح سمائی ہوئی تھی۔ جو تڑپ رہی تھی۔ پھڑک رہی تھی۔ اور پھڑکتی بھی کیوں نہ؟

محترم شاہ زین حسن نے سنگھاڑے کو اپنے جوتے پالش کرنے سے سختی سے منع کر دیا تھا۔ چچی کے ہاتھ سے ٹرے لے کر باورچی خانے میں جا کر کھانا تناول کیا گیا تھا... رات کو کھانے کی میز پر سب سے پہلے موجود... اور وہ بھی ایسے کہ منہ بنا ہوا... سنجیدگی کی چادر اوڑھے... ہر بات کا ناپا تلا جواب... زود رنج لڑکیوں کے دل تو رنجیدہ تھے۔ مائیں بھی اس کا موڈ بحال کرنے میں ہلکان ہوتی رہیں۔

☆ ☆ ☆

"یہ اوما کچھ دنوں سے نظر نہیں آ رہی۔" شیراز حسن نے اچانک ہی سر اٹھا کر رومی سے پوچھا۔ ان کا ٹیبل لیمپ رات جلتے جلتے اچانک ہی بند ہو گیا تھا۔ رومی اسی کے آپریشن میں مصروف تھا۔

"اوما اپنی اور گھر والوں کے درمیان پھر تائی چچی رہی ہے آج کل۔"

"کیوں...؟" وہ ذرا سا چونکے۔

جواباً" رومی نے ساری کتھا کہہ سنائی۔ وہ بھی نہایت دلچسپ پیرائے میں۔

"شاہ بھیا نے اپنی دانست میں صرف چھیڑا تھا۔ یہ نہیں دیکھا کہ کس کو چھیڑا ہے۔؟ انہوں نے کچھ کہا' اوما آپی نے جواباً" بہت کچھ کہا... لیکن کہہ کر جانا کہاں تھا۔ سارا گھر ہاتھ دھوئے بغیر ہی ان کے پیچھے پڑ گیا۔ عائشہ چچی نے ناک میں دم کر رکھا ہے کہ جا کر شاہ سے معافی مانگو۔ اب یہ ہو تو ہو کیسے؟ اوما آپی اور معافی تلافی۔ سورج تو ابھی مشرق سے ہی نکلتا ہے ناں بھیا۔"

رومی ہنس رہا تھا۔

شیراز حسن سنجیدہ تھے۔

"نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔ اگر وہ غلطی پر ہو تو بہت جلدی تسلیم کر لیتی ہے۔ لیکن اگر وہ اپنی دانست میں ٹھیک ہے تو پھر واقعی اسے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔"

"بات تو مذاق میں ہی ہوئی تھی۔ پھر نہ جانے کیوں اتنا بڑا ایشو بنا لیا گیا۔"

رومی بار بار سوئچ آن' آف کر کے لیمپ چیک کر رہا تھا۔

"ایشو اس لیے بنا رومی! کہ یہ باتیں عظمیٰ نایاب نے کہی ہیں۔ کسی اور نے کہی ہوتیں تو صرف مذاق ہی کہلاتیں۔ مان لو کہ ہم آج بھی وحید چاچو کی اولاد کو اس گھر میں دوسرے درجے کا فرد سمجھتے ہیں۔ اور یہ تینوں بچے نہایت خود داری اور آہنی ارادوں سے اپنی دو نسلوں کی غلطی بھگت رہے ہیں۔"

"میں سمجھا نہیں۔" رومی ان کے قریب آ بیٹھا۔

"دیکھو' پہلی غلطی دادا صاحب نے کی تھی۔ گاؤں کی انتہائی سادہ مزاج عورت کو ایک نہایت با اثر اور متمول گھرانے کی عورت کے مقابل لائے اور پھر تا عمر وحید چاچو کے حقوق غصب ہونے کا تماشا دیکھتے رہے۔ دوسرا غلط قدم وحید چاچو کا تھا جنہوں نے اپنی ماں کی میں مناسب مقام دلوانے میں ناکام رہے۔ الٹا سارے مسئلوں سے جان چھڑانے کو کوسوں دور جا بیٹھے۔ اور میں جانتا ہوں رومی! اس سارے عرصے کے اچھے اور برے وقت کا عظمیٰ نے کس حوصلہ مندی اور جرات سے سامنا کیا ہے۔ وہ سب کے ساتھ ہنستی بولتی' کھیلتی ہے لیکن اس کی آنکھوں میں کبھی سوچ اور فکر کی تحریر پڑھنا۔ وہ تمہیں اپنی عمر سے کئی گنا بڑی نظر آئے گی۔ میرے کمرے کی کھڑکی اس کے آنگن میں کھلتی ہے۔ میں نے عائشہ چچی کو سوتے اور اسے رات' رات بھر جاگ کر ٹہلتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کا ضبط' اس کا ظرف باکمال ہے۔ کہنے والے کو پلٹ کر جواب نہیں دیتی۔ جذب کر لیتی ہے۔ اور ایسے لوگ بہت عظیم ہوتے ہیں۔"

"آپ اتنا زیادہ جانتے ہیں اوما آپی کو...؟" رومی کو واز حد حیرت ہوئی تھی۔

"ہاں۔ یہ لڑکی مجھے بہت عزیز ہے۔ میرے ساتھ جو حادثہ ہوا۔ اس کے بعد مجھے بہلانے کی سب سے زیادہ کوششیں اوما نے کیں۔ اور میں نے اس کی عزت نفس کے مینار بلند کرنے کے لیے اپنے ہر دکھ کی سانجھ اس سے کی۔ میں اپنے کام کے معاملے میں اوما پر بہت زیادہ بھروسا کرتا ہوں۔ کیونکہ اس کی ذہانت چولہے' چوکی سے کہیں بڑھ کر ہے۔

وہ سوتیلے پن اور باپ کے بزدلانہ رویے کی شکار نہ ہوئی ہوتی تو اس کی قابلیت اسے کہیں بہت اوپر لے جا سکتی تھی۔

"شیراز بھائی! اس گھر کے بڑے آپ کا کہا مانتے ہیں۔ پھر آپ نے ان کے لیے کوئی کوشش..."

"نہیں کر سکا۔ کیونکہ میں خود لاعلم تھا۔ چہروں کو پڑھنے کے ہنر سے ناواقف۔ مجھ پر جو حادثہ گزرا... اس نے مجھ پر بہت سے راز فاش کیے جن میں سے ایک راز عظمیٰ نایاب تھی۔ اور اس وقت کوشش کا زمانہ بیت گیا تھا۔"

شیراز حسن کے لہجے میں تاسف ہی تاسف تھا۔

روی بنا چھ سے چپ چاپ ان

☆ ☆ ☆

رمضان المبارک کی آمد کے ساتھ ہی مدیحہ پھپھو کی آمد کی اطلاع بھی مل گئی۔

"بس عید تک رکوں گی۔ اسی دوران شاہ زین کی شادی اور پھر واپسی۔ نثار صاحب ابھی وائنڈ اپ کے لیے راضی نہیں ہو رہے۔ کم سے کم بھی چھ' آٹھ ماہ ہمیں لگ جائیں گے' تب تک شاہ زین پاکستان میں اچھی طرح سے سیٹ ہو جائے گا۔"

اور اس تمام گفتگو کے جس حصے نے توجہ جکڑی۔ وہ تھی شاہ زین کی شادی۔ دبا دبا سا جوش ایک بار پھر انگڑائی لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

فرح کا سلم ہونے کا بخار اک بار پھر زور پکڑ گیا۔ روزہ رکھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ سارا دن چوری چھپے پھل' سلائس' قہوہ لیتی رہتی۔ بڑی چچی عید کے بہانے ارم اور افشین کو پارلر کا چکر لگوا لائیں۔ اریبہ نے اپنی پلکوں کی جاذبیت بڑھانے کے لیے کیسٹر آئل کا متواتر استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔

بھنڈی بغور ان کے چہروں کو دیکھتی پھر خضریٰ اور ضویا کے سر ہو جاتی۔

"وہ سب تو گوڈے گوڈے لشکارے' چمکارے مار رہی ہیں۔ اور آپ دونوں اس سڑی ہوئی حبس زدہ شام میں لان کی مٹی گھٹا پھانک رہی ہیں۔ نہ آپ کی پھپھو نے نہیں آنا۔"

"بھنڈی یار! تنگ نہ کر۔" ضویا چڑ کر اسے وہاں سے ہٹا دیتی۔ وہ اپنے اسٹیج ڈرامے کی ریہرسل میں کسی کی مداخلت برداشت نہ کرتی تھیں۔

عائشہ چچی باقی سب لڑکیوں کو نظر بھر کر دیکھتیں اور پھر اوما کے چہرے پر نگاہ ٹکا دیتیں۔

"میری بیٹی کسی سے کم تو نہیں۔" مامتا نچھاور ہو جاتی۔

"ستارے کی چمک دمک کتنی ہی ہو۔ سورج کے سامنے دکھائی نہیں دیتا۔"

دعوتیں تو بس تائی' چچی ہی بھگتا آتی تھیں کہ لڑکیوں کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ لے دے کر یہ دو ہی گھرانے تھے جو ایسی خوشی کی جھلک دکھلاتے تھے۔ ایک انجو مامی۔ جن کی دعوت کبھی کبھار لیکن نہایت اعلا پائے کی ہوتی تھی۔ وہ کانونٹ سے پڑھی تھیں اس زمانے میں' جب کانونٹ کے طلبہ و طالبات اپنی شستہ انگریزی اور اکڑی ہوئی گردن کی وجہ سے کسی بھی تعلیمی ادارے میں دور سے پہچانے جا سکتے تھے۔ پرائیویٹ کالجز اور اسکولز کا ان دنوں ایسا رواج نہ تھا۔ میٹرک کے بعد ہر ادارے کے طالب علم گورنمنٹ کالج میں ہی پائے جاتے تھے۔ اور یہاں کانونٹ زدہ طبقے کا طوطی بڑھ چڑھ کر بولتا تھا۔ اور انجو مامی کا طوطی ابھی تک بولتا تھا۔

الف تا ے انگریزی۔

اور اس انگریزی کے متاثرین میں تائی چچیوں کے ساتھ ساتھ بھنڈی بھی شامل تھی۔

"جب دیکھو۔ گوڈے گوڈے انگریجی۔"

چھوٹی چچی تو انہیں دیکھتے ہی کسی نہ کسی کام میں مشغول ہو جاتیں۔

"اب کون بیٹھ کر اس کے ساتھ دماغ کھپائے۔ حال بھی پوچھو تو جواب آئے گا۔

"اللہ زشکر" منہ بھی نہیں تھکتا ان کا۔"

انجو مامی کے تین ہی بچے تھے۔ شہزاد' ارسلان اور فاطمہ۔

ارسلان جیالوجی میں ایم فل کر رہا تھا۔ صرف اور صرف انجو مامی کے کہنے پر۔ وگرنہ یار دوست تو کب کے ملازمت سے وابستہ ہو چکے تھے۔

وہ برملا کہا کرتا تھا۔

"میری ماں پاگل ہے۔"

"پی۔ ایچ۔ ڈی سے پہلے تمہیں چھوڑوں گی نائیں میں۔"

"فاطمہ کی اردو حد درجہ کمزور تھی۔ اسے آج تک یہ ہی معلوم نہ ہو سکا تھا کہ ناک' اخبار اور میز ہوتا ہے

"قسم سے فاطی! ایک بار اردو میں پاس ہو کر دکھا دے۔ پورا ایک ہزار تیرا۔"

اور فاطی جی جان سے یہ چیلنج قبول کرنے پر تیار۔

تینوں بہن بھائی نہایت سادہ' مخلص' بے ریا تھے۔

ان کے گھر جانے میں لطف ہی کچھ اور تھا۔

دوسری دعوتیں عائشہ چچی کے گھر ہوا کرتی تھیں۔ وہ پکانے اور کھلانے کی بے حد شوقین تھیں۔ اکثر و بیشتر ہی کھانے پینے کا اہتمام کرتی نظر آتی تھیں۔ کبھی حلوہ پوری پہ دعوت ہو جاتی۔ کبھی پاپڑی چاٹ اور دہی بھلوں کی محفل ہوتی اور کبھی کبھار بس آلو بھرے سموسے اور چائے ہی ان کے لطف کا سامان بنتی تھی۔

ایسے موقعوں پر خوب ہی ہنسی مذاق اور لطیفے بنتے۔

آج بھی خوشی کا وہی عالم تھا۔ انجو مامی کی طرف دعوت۔ کسی پکنک سے کم نہ تھی۔ دعوت پہ جانے کو سب ہی تیار تھے۔ روزہ دار بھی اور روزہ خور بھی۔

لڑکیاں الماریاں کھولے بند سوٹوں کو ہوا لگوا رہی تھیں۔ کوئی آئی برو بنانے بیٹھ گئی' کسی نے منہ پر ماسک مل لیا۔ کوئی میچنگ جوتی کی تلاش میں نکل گئی۔ کسی نے ہم رنگ ٹاپس کے لیے منت سماجت شروع کر دی۔

سہ پہر کو بلال بھائی کی گاڑی تائی چچیوں کو لے کر انجو مامی کی طرف روانہ ہوئی تو عظمیٰ نایاب عرف اوما ابھی تک لینز ہاتھ میں لیے پھر رہی تھی۔

"دائیں طرف کے سب لوگ پیچھے پیچھے ہٹ جائیں۔" انگلی کے پوروں پر لینز لیے وہ دہائی دے رہی تھی۔ تیسرے کمرے میں کہیں جا کر ارم دکھائی دی۔

"اوہ خدایا۔ شکر ہے۔ پوری دنیا دکھائی دینے لگی۔" اس نے بڑی بڑی آنکھیں پٹپٹائیں۔ احتیاطاً عینک بھی پرس میں رکھ لی تھی۔

گاڑی میں ٹھنس کر بیٹھتے ہوئے بھی وہ ساتھ بیٹھی افشین کو مسلسل کہنیاں مارتی رہی۔

"اپنے بال سمیٹو۔ میرے لینز۔"

پھپھو کی آمد کے بعد تو گویا تائی' چچیاں اپنی اپنی ذمہ داری سے ہی بری الزمہ ہو گئیں۔ باتیں' عبادت' پھر باتیں اور پھر عبادت۔ بس یہ دو ہی کام تھے۔

عید کے لیے کپڑوں کی خریداری بھابھیوں کے سپرد تھی۔ اور بھابھیوں کے بغیر لڑکیاں بازار جانے کا سوچ بھی نہ سکتی تھیں۔ رابعہ اور بخت بھابھی ہر روز ایک پارٹی کو ساتھ لے کر نکل جاتیں۔ فاران بھائی کی بیگم نائمہ کی گود میں دو ماہ کا صائم تھا لہٰذا وہ گھر میں بچوں کی نگرانی کرتیں۔

ان ہی دنوں انجو مامی نے ایک شام افطاری کی دعوت دے ڈالی۔

لڑکیوں کی تو چیخیں ہی نکل گئیں۔

"آہستہ ہنسو۔ میرے لینز۔
"ارے کھڑکی تو بند کردو یار! تیز ہوا میں لینز اڑ اڑ آ گیا تو اماں سے بس جوتے ہی پڑیں گے۔"
"اف خدایا۔ کہاں سے آ گیا۔ بے ہودہ لینز۔ اوہ! نکال اپنی عینک۔ تم تو پہلے ہی پہچانی نہیں جارہیں۔ وہاں دعوت پر تو لوگ تمہارے چہرے پہ آنکھیں ہی ڈھونڈتے رہ جائیں گے۔" طلال چڑ گیا تھا۔
وہ جواب دیے بغیر نخرہ دکھاتی۔ اٹھلاتی آگے بڑھ گئی۔
سب کی سب ٹھیک ٹھاک ہو کر آئیں۔
لان کے دیدہ زیب رنگوں والے آنچل۔ لمبی قمیض۔ کلیوں والے کرتے۔ فراک ہم رنگ چپلیں۔ خوشبوؤں میں بسے کنوارے نوخیز وجود۔
انجومامی کا لان اس شام تتلیوں سے بھر گیا تھا۔
"کتنی خوش ہیں بچیاں۔ کبھی کبھار ان کے باہر نکلنے کا اہتمام ہونا چاہیے۔"
مدیحہ پھپھو کی نظریں ان کے شاداب کھلتے چہروں سے ہٹتی نہ تھی۔
"اللہ ان ہی میں سے کسی کو میرے بیٹے کا نصیب بنادے۔" انہوں نے دل سے خواہش کی تھی۔
"آج کسی کو جانے کی اجازت نہیں ملے گی رات بھر۔" شنزا خوش تھی اور خوب شور مچاتی ان سب کو اپنے کمرے تک لے جارہی تھی۔ جہاں اس نے عید کے کپڑوں کے لیے نت نئے ڈیزائن اپنے کمرے کی دیواروں اور دروازے پر چسپاں کر رکھے تھے اور اب کئی گھنٹوں تک وہی ڈسکس ہونا تھے۔
اوما حسب عادت باورچی خانے میں آ گئی تھی۔
انجومامی سیاہ ساڑھی میں تمام انتظامات کے آخری مراحل کا جائزہ لے رہی تھیں۔
"مامی کوئی کام؟" اس نے حسب عادت ڈھکن اٹھا اٹھا کر ساری چیزوں کا جائزہ لیا۔
خانساماں کی مدد سے ساری ڈشز انجومامی نے خود تیار کی تھیں۔ صرف کوفتوں کا پتیلا صبح عظمیٰ نے مرسلین کے ہاتھ بھجوایا تھا کہ ماموں ریاض کو کوفتے بس اسی کے ہاتھوں کے پسند تھے۔
"عظمیٰ ڈیر! تم سب چیزوں کو ایک بار چکھ ضرور لینا۔"
وہ سرہلاتی سلاد کی طرف متوجہ ہو گئی۔
روزہ افطار ہونے میں کچھ ہی وقت تھا۔ وہ تین طرح کے سلاد اور افطاری کے لیے کھجوروں میں بالائی بھر کر فارغ ہوئی تو بیرے سرسبز لان میں ٹیبل لگا رہے تھے۔
"اوما۔ اوپر۔ اوپر۔ ہم سب یہیں ہیں۔ آجاؤ۔" وہ لاؤنج میں داخل ہی ہوئی تھی جب کہ طرح طرح کی آوازیں گونج رہیں۔
افشین، فرح اور فاطمہ کھڑکی میں جھکی ہاتھ ہلا ہلا کر اسے متوجہ کررہی تھیں۔ کہیں پھر کسی امی کے ہاتھ لگ جاتی تو اسے جان چھڑانا مشکل ہو جاتی اور ایسی محفلوں میں بھلا اوما کے چٹکلوں کے بغیر مزا کہاں۔
"آرہی ہے اوما بھی۔" فرح نے آواز بلند کی۔ اور اگلے ہی پل۔ ایک زوردار چیخ۔
"کیا ہوا؟" لڑکیاں سرعت سے کھڑکی پر جھکیں۔
اور اس کے بعد پبلک کی گنہگار آنکھوں نے جو منظر دیکھا۔
اس میں عظمیٰ نایاب عرف اوما کا دبلا پتلا، نازک اور خوش قسمتی سے سجا سنورا، خوشبوؤں سے لبریز وجود شاہ زین کے مضبوط، وزشی، کسے ہوئے بازوؤں میں سمایا ہوا تھا۔
"ہائے۔"
"ئیں۔"
ابھی چند ثانیے پیشتر تو اوما سب سے بلند سیڑھی پہ تھی اور شاہ زین محض جینز اور بنیان میں ملبوس۔ دو قدم نچلی سیڑھی پر۔ پھر۔ یہ اب۔
اف پلکیں جھپک جھپک کر دوبارہ اس منظر کی تردید چاہی مگر کہاں۔
اسٹار پلس کا ڈرامہ ہوتا تو اوما و شاہ زین کے ساتھ ساتھ بحیثیت ناظرین دس، پندرہ منٹ کے اس رومان پرور حادثے سے لطف اندوز ہو لیتے مگر یہاں تو عظمیٰ

کیا ہی بجلی کی رفتار ہوگی جس طرح تڑپ کر اس کے حصار سے آزاد ہوئی تھی اور بجلی کی تڑپ کے ساتھ گھن گرج تو ہوتی ہی ہے۔ سو وہ گرجی بھی اور برسی بھی شاہ زین معصوم تو ارے "ارے" ہی کرتا رہ گیا۔
آج سے پہلے تو کسی نے اس قدر وضاحت سے اسے مشرقی و مغربی روایات کے درمیان فرق نہیں سمجھایا تھا۔ نہ ہی اخلاقیات، اقدار، روایات، شرم و حیا پر لیکچر۔
"ہائیں! یعنی کہ ...." وہ سمجھ نہیں پارہا تھا۔ ان سب چیزوں کا یہاں کیا تذکرہ۔
وہ تو صبح سے یہیں قیام پذیر تھا اور اب نہانے کے بعد شنزا سے اپنی شرٹ لینے آیا تھا۔ جواب سے چار گھنٹے قبل استری کرنے کی غرض سے دی گئی تھی۔
اب اس سے دو قدم اوپر جاتی عزیز "اوما" اگر پاؤں رپٹ جانے کے سبب سیدھی اس کی بانہوں میں آسمائی تھی تو اس میں اقدار و روایات اور مشرق کہاں سے آگئے؟ اور اگر اوما ڈیر کو سیڑھیوں پر فٹ بال کی طرح اچھلنے، لڑھکنے سے بچانے کے لیے انہوں نے نادانستہ اس پر اپنی گرفت مضبوط کرلی تھی، جو حواس بحال ہوتے ہی کمزور بھی پڑ گئی پھر اس میں اخلاقیات اور شرم و حیا؟
وہ اس کے سر پہ چڑھے ہیڑو ہپڑ کچھ بولے جارہی تھی۔
پھر جب خفت مٹائے نہ مٹی تو وہیں سیڑھیوں پہ بیٹھ کر چھکوں پھکوں رونا شروع کردیا۔
شنزا نے بھاگ کر شرٹ اسے تھمائی اور کمرے کی طرف دھکیلا۔
تب وہ سمجھا۔ محترمہ اس بات پر خفا ہورہی تھیں کہ صرف بنیان پہن کر باہر آنے کی جسارت کیوں کی؟
شاہ زین نے شرٹ جھٹک کر گویا اپنا غصہ اتارا اور دندناتا ہوا ارسلان کے کمرے میں جا گھسا۔
انجومامی کو کسی نے خبر کی تھی۔ وہ ساڑھی سنبھالتی اوپر لپکیں۔
وہ اسے بازوؤں کے گھیرے میں لیے پچکارتی، سہلاتی، واش روم تک لے آئیں۔
روزہ افطار ہونے میں کچھ ہی منٹ تھے۔ اس نے خود کو سنبھالا دے کر انجومامی کو واپس بھیجا اور خود واش بیسن پر پانی کے چھپاکے مارنے لگی۔ خوب رگڑ رگڑ کر منہ دھویا۔
رونے کے سب اثرات ختم کرنے کی کوشش کی۔ پھر چہرہ اٹھا کر آئینے میں دیکھنے کی کوشش کی۔ سب کچھ دھندلا دھندلا سا دکھائی دے رہا تھا۔
اس نے زور زور سے پلکیں جھپکیں۔ پھر معلوم ہوا رونے کے دوران جو آنکھیں رگڑیں تو لینز دغا دے گیا تھا۔ اس نے خفگی سے دوسرا لینز بھی اتار کر واش بیسن میں دے مارا۔ اور عینک لگا کر نیچے اتر آئی جہاں سائرن ہونے کے ساتھ ہی سب نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے تھے۔ وہ بھی لپک کر ان لوگوں کے ساتھ شامل ہو گئی۔ کھانے کے بعد محفل نعت لان میں ہوئی۔
کھلے لان میں جب ہوا سرسرا رہی تھی اور سفید بادل ٹکڑیوں کی شکل میں چاند سے لکن میٹی کھیل رہے تھے۔ خوشبودار فضا میں مرسلین کی پرسوز آواز میں انہوں نے کتنی نعتیں اور دعائیں سن ڈالیں۔ مرسلین کے کتابی چہرے پر سنجیدگی اس کی عمر سے کچھ زیادہ چھلکتی تھی اور اس کی آنکھیں بہت گہری اور خوبصورت تھیں اور ان آنکھوں میں ایسا مقناطیس جڑا تھا کہ مقابل کو دیکھتا اور وہ ایک پل میں اپنا سب کچھ ہار جاتا تھا۔

مدینے میں صبا جانا تو اتنا کام کر دینا
رسول اللہ ﷺ کو میری غریبی کی خبر دینا

تایا ابا دونوں ہاتھوں میں چہرہ دیے ہولے ہولے سسک رہے تھے۔
"انسان بہت کم مایہ ہے۔ گناہوں کی پوٹ۔۔۔ لیکن کتنے فخر سے دندناتا پھرتا ہے۔"
کسی نے ہولے سے سرگوشی کی تھی۔
ایسی پرنور محفل تھی کہ اکثریت کے دل خدا کی

کبریائی کے سامنے جھکے ہوئے عاجزی سے فریاد کررہے تھے۔

یہ کہہ دینا ہزاروں عیب رکھتا ہوں ہنر دینا

مرسلین کی آواز جیسے سب کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے تھی اور اسی پرنور بندھن میں بندھی ضویا نے گویا پہلی بار مرسلین کو دیکھا تھا۔

وہ حیران تھی۔ اور پریشان بھی۔

یہ وہی مرسلین ہے جسے اس نے ہمیشہ اپنے آس پاس بولتے، کھیلتے، ہنستے دیکھا تھا۔ رنگین دھاگوں سے کڑھا سفید دوپٹہ سر پہ اوڑھے... دونوں گھٹنوں پہ ٹھوڑی ٹکائے وہ گم صم بیٹھی تھی۔ جب قریب بیٹھی خضریٰ نے اسے ٹہوکا دیا۔

"اٹھنے کا ارادہ نہیں کیا؟"

محفل ختم ہوچکی تھی۔ سب لوگ اٹھ چکے تھے۔ ضویا چونکی پھر نہ صرف وہ اٹھی بلکہ خضریٰ کا ہاتھ تھام کر دوڑتی ہوئی سب سے پہلے گاڑی میں جا بیٹھی تھی۔

"خضریٰ! میرا دل دیکھو۔" اس نے خضریٰ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پہ رکھا۔

"کتنی زور سے دھڑک رہا ہے۔ یوں جیسے ابھی باہر آجائے گا۔"

"مجھے تو کچھ نہیں محسوس ہورہا؟" خضریٰ نے ناک چڑھائی۔

"بدتمیز! اچھا سنو۔ عائشہ چچی نے کہیں مرسلین کا رشتہ وشتہ تو نہیں دیکھ رکھا۔"

ہائے! کم عمری بڑی بے صبری۔ وہ اتھل پتھل سانسوں میں پوچھ رہی تھی۔

"کیا مطلب؟" خضریٰ ہونق سی ہوگئی۔

"دیکھو۔ میں تمہاری دوست ہوں ناں پلیز... مجھے اپنی بھابھی بنالینا۔"

"آہ... ہاہ..." خضریٰ کا منہ آپوں آپ کھل گیا تھا۔

"کیا کہا تم نے..." اپنی سانس بحال کرنے میں خضریٰ کو خاصا وقت لگا۔

ضویا دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے بیٹھی تھی۔

قطار بہہ رہے ہیں۔

"ارے!" خضریٰ کو اس کی حالت دیکھ کر ہنسی آئی پھر تو وہ ہنستی ہی چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

"توبہ... توبہ ہماری لڑکیوں کو تو ایسے کام نہ آئے۔" چھوٹی چچی خوامخواہ ہی کلس رہی تھیں۔

"کن کاموں کی بات کررہی ہیں۔ ماشاءاللہ ہر ہنر، ہر کام سے واقف ہیں ہماری بچیاں۔" بڑی چچی نے قدرے ناگواری سے کہا۔

"اوفو! آپ کو تو لگتا ہے کچھ خبر ہی نہیں۔" وہ کھسک کر بڑی چچی کے قریب ہوئیں اور کل کی افطاری میں اوما اور شاہ زین کے "حادثے" کو مرچ مسالہ لگا کر بتایا۔

"آئے ہائے۔ یہ کب کی بات ہے، ہمیں کانوں کان خبر نہ ہوئی۔"

"لیجیے۔ اب یہ کوئی ایسی بات تو نہ تھی جو ٹی وی، ریڈیو سے خبریں نشر ہوتیں۔ اوما پاؤں پھسل کر گرنے کو تھی۔ شاہ بھیا نے بچالیا گرنے سے بات ختم۔ آپ لوگ تو خوامخواہ ہی بات کو افسانہ، ڈرامہ بنارہی ہیں لیکن خیر آپ کا بھی کیا قصور؟ اسٹار پلس سے ہمیں یہ ہی کچھ تو سیکھنے کو ملا ہے۔" یہ ضویا تھی، آنکھیں بند کرکے اوندھی لیٹی ٹانگیں جھلا رہی تھی۔

"جانے دو لڑکی! یہ سب "طریقے" ہوتے ہیں لڑکوں کو پھانسنے کے۔ تمہیں بھلا کیا خبر۔ رات افطاری سے آکر بستروں پہ پڑیں اور دھت ہورہیں۔ اور وہ اوما ٹفن بھر بھر لائی تھی انجو کی طرف سے۔ یہ بڑی سی ٹرے سجائی اور سیدھی جا گھسی شیراز کے کمرے میں۔ پھر رات گئے تک ٹرٹر کی آوازیں۔ جانے کون کون سی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔" بڑی چچی نے قدرے نیچی آواز میں دل کے بھڑاس نکالی تو ضویا قدرے چڑ سی گئی۔

"کمال ہے۔ اس گھر میں اول تو ہر ایک کو اپنی اپنی پڑی رہتی ہے۔ پھر اگر کوئی دوسروں کا خیال کرے تو وہ

خیال بھی نہ تھا کہ شیراز بھائی نے عین وقت پر آنے کا کہا مگر عادت سے مجبور ہوکر آئے نہیں اور گھر میں تھا کون؟ جو ان کے لیے افطاری بناتا۔ تائی اماں مارے مروت کے چپ رہیں۔ اوما نے خود انجوامی سے کہہ کر شیراز بھائی کے لیے کھانا نکلوایا اور پھر رات گئے وہ ٹرٹر کرنے کے لیے اکیلی وہاں نہیں تھی۔ خود بلال بھیا، ارسلان، شاہ زین اور رابعہ بھابھی بھی وہیں موجود تھیں۔"

"نہ تمہیں کیوں اتنی تکلیف ہورہی ہے۔ آگئی اٹھ کے کہیں سے وکیل صفائی۔ چلو ہٹو یہاں سے۔ یہ دوسروں سے ہمدردی کرتی رہ جائیں گی اور وہ اپنے داؤ پیچ لڑا کرلے اڑیں گی لڑکے کو۔"

"گھر بھرا ہوا ہے لڑکوں سے... اتنے داؤ پیچ آتے تو پہلے ہی لڑالیتیں۔ خوامخواہ عائشہ چچی کے سینے پہ مونگ دل رہی ہیں اب تک۔ اور لے بھی اڑیں تو ہمیں کیا غم۔ بڑے بڑے لوگ پھرتے ہیں آس پاس۔ بس نظر آنے کی بات ہے۔"

"چل ہٹ کم بخت! کیا بڑھ بڑھ کر بولے جارہی ہے۔" پیٹھ پہ زور کی دھپ پڑی تو وہ اچھل کر بیڈ سے ہی نیچے اتر گئی۔

"میں نے ایسا کیا کہہ دیا۔ آپ تو بس یونہی۔" وہ ہنستی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

بڑی چچی نے کچھ پرخیال نگاہوں سے دروازے کے ہلتے ہوئے پردے کو دیکھا۔

"یہ کیا کہہ گئی بھابھی! کون پھرتا ہے آس پاس؟ کس کی بات کرگئی ہے؟"

"سنگھاڑے کی بات کررہی ہوگی۔ ایک وہی عاشق ہے اس پر۔ دس گیندوں کو آگ میں جھونکا۔ اگلے دن کم بخت مارا نئی گیند بغل میں دبا کرلے آتا ہے۔ کہتا ہے مجھے ضویا ہی بی کا شوق بڑا اچھا لگتا ہے۔ میرے گھر بیٹی ہوئی تو اس کا نام ضویا ہی رکھوں گا۔ لو بتاؤ بھلا۔ نہ منگنی نہ شادی۔ بچوں کی باتیں کرلو۔" چھوٹی چچی جلی بھنی بیٹھی تھیں۔

"ہاں۔ کل ہی بال سیٹ کروا کے آئی ہے۔ اپنی عمر سے کئی حصے چھوٹے لگ رہی ہے آج۔"

☆ ☆ ☆

عصر کے بعد کا وقت تھا۔

مدیحہ نماز پڑھ کر تسبیح کے دانے گھماتی راہداریوں میں بھٹکتی پھر رہی تھیں۔ جس کمرے کا دروازہ کھولتیں۔ یا اے سی کی زون زوں۔ یا انسانی خراٹے۔

"توبہ... پاکستانی قوم۔ کس قدر سوتی ہے۔"

"چلتے چلتے باورچی خانے تک پہنچیں۔ انواع و اقسام خوشبوئیں۔ دیگچوں، پتیلوں کی کھٹر پٹر۔

"توبہ... پاکستانی قوم... کس قدر کھاتی ہے۔"

خیال تھا، ملازم افطاری کی تیاری کررہے ہوں گے۔ سر ڈال کر اندر جھانکا بڑے بڑے پتیلے، کڑاہی، چمچے، کفگیر۔ اور ان سب کے درمیان۔ اوما، بھنڈی۔ عائشہ چچی اور رابعہ بھابھی۔

کچن خاصا کشادہ تھا۔ انہیں بھی کھڑے ہونے بلکہ بیٹھنے کو جگہ مل ہی گئی۔ بیٹھ کر غور فرمایا۔

دہی بڑے۔ فروٹ چاٹ، چکن رول، اور کھانے کے لیے بریانی، کٹسٹرڈ، چکن قورمہ، سبزیوں کی بھجیا۔

عائشہ چچی کرسی گھسیٹ کر ان کے پاس میز پہ آ بیٹھیں اور کھجوروں میں بالائی بھرنے لگیں۔

"باقی سب گھر والے کیوں گھوڑے گدھے بیچ کر سو رہے ہیں۔ اتنے لوگوں کی افطاری، کھانا۔ چلو بھنڈی! باقی لڑکیوں کو آواز دو جاکر۔"

"رمضان کے مہینے میں ہی کچھ کام بڑھ جاتا ہے۔ ورنہ باقی دنوں میں تو سب اپنا اپنا ہی کھاتے پکاتے ہیں۔" عائشہ نے گھبرا کر وضاحت کی۔

"لیجیے پھپھو! ذرا جلدی سے چیک کریں۔ فروٹ چاٹ میں ذرا سی مٹھاس کم یا زیادہ ہو تو فاران بھائی کا موڈ فوراً ہی خراب ہوجاتا ہے۔"

"وہ نفاست سے بال باندھے ایپرن لگائے مگن

سب آج روزہ نہ رکھ سکی تھیں۔
"کس کے ہاتھوں کا کرشمہ ہے یہ۔"
"عظمیٰ نایاب المعروف اوما دی گریٹ۔" اس نے چمچہ لہرایا اور کڑاہی کے نیچے آگ جلائی۔
"واہ بھئی۔ یہ ہے سگھڑاپا۔ روزے کے ساتھ بھی کمال کی چاٹ بنائی ہے۔ میں تو کہتی ہوں عائشہ! اوما کے ہاتھ میں ذائقہ تم سے بھی کچھ بڑھ کر ہے۔ شاہ زین بھی کہہ رہا تھا۔" وہ جانے کیا کہنے جا رہی تھیں۔
"اف۔" بہت تیزی سے وہی بڑوں کے لیے پیاز کاٹتے ہوئے چھری سے ہلکا سا کٹ انگوٹھے کی پور پہ لگ گیا تھا۔
معمول کی بات ہے۔" اس نے خود کو باور کرایا۔
"کہ عائشہ چچی کے گھر جو مچھلی کھائی اس کا ذائقہ ابھی تک نہیں بھولتا۔"
رول ہلکے براؤن ہو چکے تھے۔ اوما نے پلیٹ میں نکال کر ان کے سامنے رکھے۔ رابعہ بھابھی کا منا اٹھ گیا تو وہ قورمے کا دیگچہ بھی اس کے حوالے کر گئیں۔ بھنڈی تو شاید وہاں باندھ کر بٹھائی گئی تھی۔
"اماں! یہ کاٹیں ذرا جلدی سے۔" اس نے درجن بھر لیموں اٹھا کر ماں کے سامنے رکھے۔ قورمے کے دیگچے میں چمچہ ہلایا اور پھر رول کی طرف متوجہ ہو گئی۔
"کس قدر پھرتیلی ہے یہ لڑکی۔" پھپھو نے نہایت توجہ سے اس کا نازک سراپا دیکھا۔
"تمہارے انکل ایسی چٹ پٹی چیزوں کے بے حد شوقین ہیں اور شاہ زین تو۔"
املی کی چٹنی کا جار اس کے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچا تھا۔
"اوہو۔" اس نے بروقت سنبھالا۔
"بہت ہی پیٹو ہے۔ دونوں باپ بیٹا اکثر ہی مختلف ڈشز ٹرائی کرتے رہتے ہیں۔ اوما بچے! رول بھی بہت مزے کے ہیں۔"
"کیا مزے کے ہیں؟" زندگی سے بھرپور آواز باورچی خانے کے دروازے پہ گونجی اور اوما کے ہاتھ

"آہ۔" ایک تیز کراہ کے ساتھ وہ چولہے سے دور ہٹی۔
"ارے کیا ہوا؟"
"کچھ نہیں بس۔" اس نے ہاتھ جھٹک کر تکلیف دور کرنے کی کوشش کی۔
وہ تینوں پل بھر میں اس تک پہنچے تھے۔
پھپھو نے اس کے ہاتھ سے چمچہ لے لیا۔ شاہ زین فریج میں سے کوئی کریم نکال لایا۔ امی نے فوراً کرسی کھینچ کر اس کی طرف بڑھائی۔
"شاہ زین بیٹے! ٹھیک سے لگانا۔ کوئی زخم زدہ نہ جائے۔ ورنہ داغ پڑ جائے گا۔" پھپھو نے ہدایت کی اور۔
وہ موصوف کرسی کھینچ کر عین اس کے سامنے بیٹھ گئے۔ کلائی جکڑی گئی تھی۔ اوما "مم" مم ہی کرتی رہ گئی۔
شاہ زین بڑی سہولت سے ہاتھ پہ پڑے سرخ سرخ نشانوں پر لیپ کرنے لگا۔
"اچھا خاصا تو جل گیا۔ لوگ کہتے ہیں ان کی ذہانت چولہے، چوکی سے بڑھ کر ہے، یہاں آ کر دیکھ لے۔ ایک افطاری بنانے میں ہی یہ حال ہو گیا۔"
زبان ننھیال والوں پہ گئی تھی۔
"پتا نہیں کون لوگ کہتے تھے۔" اوما نے ناگواری سے اپنا ہاتھ کھینچا مگر گرفت پہلے سے مضبوط ہو گئی۔
وہ تو ایک پل میں ساری کی ساری ٹھنڈی پڑ گئی۔
پھپھو کا سر کڑاہی میں تھا تو امی قورمے کے دیگچے میں گھسی ہوئی تھیں۔ کوئی بات اوما کے ہونٹوں پر آتے آتے دم توڑ گئی تھی۔
بڑی پریشان نگاہوں سے اسے دیکھا۔
بھوری آنکھیں ایک ٹک اسے گھور رہی تھیں۔
ان بھوری آنکھوں میں کیا تھا؟ وہ ان آنکھوں میں اتر کر دل کی دہلیز پہ جا کھڑی ہوئی لیکن اس سے پہلے کہ وہ بھید کا سراپائی۔ ان آنکھوں کا تاثر یک لخت ہی بدل گیا تھا۔ اور اسی تیزی سے اوما کو لوٹنا پڑا تھا۔ ایک

میں گڑ گئے تھے۔ ہونٹوں پہ بڑی دل آویز مسکراہٹ۔
اما کے ہونٹوں کو بھی یک لخت ویسی ہی مسکراہٹ نے چھوا اور اگلے ہی پل وہ دوسرے ہاتھ کے ناخن اس کے ہاتھ کی پشت پر گاڑ چکی تھی۔
"اوہ۔" کلائی ایک پل میں آزاد ہو گئی تھی۔ وہ طنزیہ انداز میں اسے دیکھتی ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی اور یک لخت ہی ٹھہر گئی۔
باورچی خانے کے دروازے پہ فرح کھڑی تھی۔ حیران، پریشان، بے یقین۔

☆ ☆ ☆

رات بھر بادل کھل کر برسے تھے۔
آنگن میں بچھے پلنگ چھوڑ کر وہ لوگ کمروں میں منتقل ہو گئے تھے۔ موسم اچھا خاصا خنک ہو گیا۔ بجلی نے وفا کی تھی پنکھا بھی ہلکی رفتار سے چلتا رہا۔
امی اور خضریٰ کب کی سو چکیں۔
مرسلین کا کمرا البتہ روشن تھا۔
"یا تو پڑھنے میں مگن ہو گیا ہو گا یا یونہی بتی بجھائے بغیر تکیے میں سر دے کر سو گیا ہو گا۔" اوما نے دریچے سے باہر جھانکتے ہوئے اپنے تھکے ذہن سے سوچا۔
نیند آج کی رات اس کی آنکھوں میں اتری ہی کہاں تھی۔ جب تک بارش کی پہلی بوند زمین پر نہیں گری۔ وہ جلے پاؤں کی بلی کی طرح سارے گھر میں گھومتی رہی تھی۔ کبھی اس کمرے۔ تو کبھی اس کمرے۔ کبھی تھک کر برآمدے کی سیڑھیوں پہ ٹک گئی۔ کبھی کھڑکی میں جھک کر اندھیرے میں ڈوبے درختوں، پودوں کو کھوجنے لگی۔
امی نے اس کی بے آرامی محسوس کرتے ہوئے ٹوک بھی دیا۔
"سو کیوں نہیں رہیں۔ ابھی کچھ دیر میں سحری بنانے کا وقت ہو جائے گا۔ لیٹ جاؤ گھڑی بھر کے لیے۔"
اور وہ لیٹ بھی گئی۔ آنکھیں بھی موند لیں۔ اور ان

وہ بے اختیار کلائی مسلتی ہوئی اٹھ بیٹھی تھی۔
پانچ مضبوط بھاری انگلیوں کے نشان ابھی بھی ثبت تھے۔ دکھائی نہ دیتے تھے، محسوس ہوتے تھے۔ وہ ان پر ہاتھ پھیرتی تھی۔ انہیں چھو کر دیکھتی تھی۔ ان پوروں کی حرارت ابھی تک اس کی نبضوں میں اترتی اور اس کے پورے وجود کو دل بن کر دھڑکاتی تھی۔
اور یہ ہی وہ نہیں چاہتی تھی۔ کہ قصد اور عہد کچھ اور تھا۔
حالانکہ ابھی تو کچھ بھی سامنے نہ تھا۔
نہ امید، نہ گمان، نہ اظہار۔
مگر اس کا وجدان سگنل دے رہا تھا۔ کوئی بتی بار بار جلتی تھی، بجھتی تھی اور بجھ کر پھر جل اٹھتی تھی۔
اور اسی جلنے، بجھنے میں ایک چہرہ ابھرتا تو دوسرا ڈوب جاتا تھا۔
دوسرا ابھرتا تو پہلا دکھائی نہ دیتا تھا۔ اور وہ خود فیصلے کی نوک پہ کھڑی ہلکان ہو رہی تھی۔
دریچے سے آتی، بارش کی خنک ہوا نے اسے ٹھہرا کر رکھ دیا تو وہ اپنے پاؤں سمیٹتی۔ بستر پہ آ گری۔ سر تا پا چادر اوڑھتے ہوئے اس نے تکیہ درست کیا اور ذہن کو پرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگی۔
"ہو سکتا ہے سب میرا وہم ہو۔ ویسا کچھ بھی نہ ہو، جیسا میں نے سمجھا۔"
"ہو سکتا ہے۔ ایسی کسی بھی گھڑی میں قدرت خود میری رہنما ہو۔"
"ہو سکتا ہے ایسی کوئی نوبت ہی نہ آئے۔ سب فیصلے اوپر ہی اوپر طے ہو جائیں۔"
کروٹیں بدل بدل کر جسم دکھنے لگا۔ تب کہیں جا کر نیند کا ہلکا سا خمار اس کے دماغ پر چھایا۔ اسی خمار میں اس نے امی اور خضریٰ کو باتیں کرتے، اٹھتے، دروازہ کھلتے، بند ہوتے محسوس کیا۔ اسی خمار میں کسی نے اسے جگانے کی کوشش بھی کی۔ اسی دھند کی اوٹ میں اس نے موذن کو اذان دیتے سنا اور پھر دھند نے دبیز ہو کر اس کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

کمرے کی کھڑکی غالباً" رات کھلی رہ گئی تھی۔
باغ میں بھیگے درختوں کی گھنی شاخوں میں چھپے تو توں، چڑیوں نے خوب ہی شور مچا رکھا تھا۔ قریب ہی کہیں بچوں کی چہکاریں بھی۔
اس نے کسلمندی سے آنکھیں کھولیں۔
کمرے کا دروازہ بھیڑ دیا گیا تھا لیکن روشن دانوں اور کھڑکی سے آنے والی روشنی سے کمرا بھر گیا تھا۔ باہر آنگن میں پانی کے بہاؤ اور جھاڑو کی شڑاپ شڑاپ کی آوازیں۔ غالباً" سنگھاڑا صفائی کے لیے آچکا تھا۔
"ہائیں۔" وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھی۔
پاؤں میں چپل اڑس کر عجلت میں دروازہ کھولا۔
چٹا سفید دن۔ خوب کھلا کھلا سا۔ مخلوق ساری کی ساری مگن۔
مرسلین بوگن ویلیا کی ڈھلکی ہوئی ڈالیاں درست کر رہا تھا۔ خضریٰ اور امی کہیں دکھائی نہ دے رہی تھیں۔
اس نے لمبا سانس لے کر دل ہی دل میں روزے کی نیت کی اور پچھلے برآمدے میں جھانکا۔ خضریٰ کبوتروں کی کابک کھولے انہیں دانہ ڈالنے میں محو تھی۔ بچے اس کے گرد جمع تھے، گردن گھما کر دوسری جانب دیکھا اور پھر گھڑی بھر کے لیے ساکت ہو گئی۔
برآمدے کی سیڑھیوں پر مدیحہ پھپھو، امی کے کندھے سے کندھا جوڑے بیٹھی تھیں۔ سگنل دیتی بتی پوری قوت سے روشن ہو گئی تھی۔
وہ بھاگ کر باورچی خانے میں داخل ہوئی۔ یہاں پہ کھڑکی عین ان کے عقب میں کھلتی تھی۔ بہت آہستگی سے دونوں پٹ وا کر کے جھانکا۔
"میں بھی صرف آپ کا عندیہ لینا چاہتی ہوں۔ باقاعدہ پیغام جیسے آپ چاہیں۔ بڑے بھیا تو ہیں ہی۔ وحید سے بھی بات کرنا ہوئی تو کر لیں گے۔ لیکن جب تک آپ فیصلہ مجھے نہ سنا دیں۔ بات باہر مت نکالیے گا۔ سمجھ رہی ہیں ناں؟"
تھیں۔ امی کے گھٹنے پر دباؤ ڈال کر جلدی فیصلے کی تاکید کرتی ہوئی وہ اٹھ کھڑی ہوئیں اور عائشہ یوں ساکت اپنی جگہ پر بیٹھی تھیں جیسے سر پر پرند آ بیٹھے ہوں اور ذرا سی جنبش سی ان کی اڑان کا ڈر ہو۔
"امی!" اس کے ذرا سا ہلانے پر وہ بری طرح چونکیں۔
"اوہ! میں تو سوچ بھی نہ سکتی تھی۔" وہ ناقابل یقین لہجے میں بول رہی تھیں۔
"امی پلیز! ابھی کوئی فیصلہ مت کیجیے گا۔" اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کر اپنا اضطراب کم کرنے کی کوشش کی۔
"کیا مطلب؟"
"مطلب..." اسے وقت ہو رہی تھی۔ وہ اپنا مافی الضمیر ماں تک کس طرح پہنچائے۔
"امی! کیا اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کا تھوڑا سا اختیار حاصل ہے مجھے۔"
وہ بنا کچھ بولے چپ چاپ اسے دیکھے گئیں۔ وہ کچھ الٹا سیدھا بولنے جا رہی ہے۔ اس کا کچھ کچھ اندازہ ہو گیا تھا انہیں۔
"امی! میں شاہ زین سے نہیں، شیراز حسن سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔"

☼ ☼ ☼

کہاں تو بوا جوتیاں گھسا گھسا کر تھک گئیں اور کسی کلرک تک کا رشتہ نہ ملا اور کہاں ایک خوبصورت، ذہین و فطین، معاشی طور پر مستحکم و مضبوط لڑکے کا رشتہ گھر چل کر آگیا اور لڑکا بھی اپنے ہی خاندان کا... نہ چھان پھٹک کی ضرورت، نہ کوئی ڈر، خدشہ نہ وہم، اور اب مہارانی کا مزاج ہی نہیں ملتا۔ ایک سے ایک لڑکی چھوڑ کر مدیحہ میری دہلیز تک آئی۔ خدا نے میری دعاؤں کو قبولیت بخشی اور اب اسے یاد آیا کہ شاہ زین نہیں شیراز۔ پہلے کیا گونگے کا گڑ کھائے بیٹھی تھی۔"
"کیا اپنے منہ سے کہتی؟" وہ منمنائی۔

خود ہی پھوٹیں۔"
"پہلے کون سا یہاں شادی بیاہ کے چکر چل رہے تھے۔ میرا خیال تھا شاید تائی اماں..."
"نہ۔ ان میں سے کسی نے کچھ کہا۔ شیراز نے یا بڑی بھابھی نے؟"
"نہیں۔"
"تو پھر...؟ جب انہیں خیال نہیں آیا تو کیا میں جا کر بیٹی پیش کروں؟"
عائشہ خوب ہی تپی بیٹھی تھیں۔
"وہ بہت بامروت ہیں۔ ہو سکتا ہے جھجکتی ہوں۔ اور ویسے یہ سب باتیں آپ لوگوں کے سوچنے کی ہیں۔ مجھ پر خوامخواہ خفا ہو رہی ہیں آپ۔" وہ بھی قدرے ناراض سی بیٹھی تھی۔
"شاہ زین باہر سے آیا ہے۔ سب کے سب اس پر نظر لگا کر بیٹھ گئے۔ گھر میں پڑے ہوئے فرشتہ صفت شیراز کسی کو نظر نہیں آتے۔ صرف اس لیے کہ وہ مجبور اور معذور ہیں۔ لیکن انہوں نے اس مجبوری کو اپنی کمزوری اور معذوری کو اپنی محتاجی تو نہیں بنایا ناں؟ بس کچھ عرصہ کے لیے لوگوں سے کٹ گئے ہیں۔ لیکن یہ دور بھی گزر جائے گا اگر انہیں کوئی مخلص ساتھ مل گیا تو۔ لیکن ہم لوگوں کو ان کی صرف محرومی دکھتی ہے۔ ان کا بھلا سا دل، ان کا روشن دماغ، ان کی قابلیت، صلاحیت کچھ بھی نظر نہیں آتی۔"
عائشہ تو لب بھینچے گویا اسی کی تقریر سننے بیٹھی تھیں۔
"اور ہاں۔ بات آپ کے لبوں سے ادا ہو تو خیال رکھیے گا۔ آپ کا سر جھکا ہوا نہ ہو ہمیں یہ قدم کسی عشق و محبت یا وقتی اور سستے جذبات کی خاطر نہیں صرف اور صرف شیراز حسن کے لیے اٹھا رہی ہوں کہ مجھے ان کی بہت "پروا" ہے۔ شیراز حسن کی جگہ کوئی اور ہوتا میں تب بھی یہ ہی فیصلہ کرتی۔"
"اس بھول میں تو بنو! تم مت رہو۔ لڑکی کی ماں اپنی زبان سے اپنی بیٹی کا بر پیش کرے تو پھر بس ایک ہی خواتین ڈائجسٹ 95 اکتوبر 2011

بات ہوتی ہے اور لوگوں نے ذہنوں پہ پہرے نہ تم لگا سکتی ہو نہ میں۔"
وہ بہت مرجھائے انداز میں کہتے ہوئے اس کے سامنے سے اٹھ گئیں۔

☼ ☼ ☼

رمضان کا آخری عشرہ شروع ہو گیا تھا۔ مدیحہ پھپھو اور شاہ زین اپنے گھر منتقل ہو گئے تھے۔
"کوشش کروں گی ان دنوں میں گھر کے کچھ خاص حصے مکمل طور پر سیٹ کر لوں۔ عید کے روز گرینڈ پارٹی میرے گھر ہو گی۔" اس روز انجو مامی اور ریاض ماموں بھی اپنے بچوں سمیت آئے ہوئے تھے، جب مدیحہ پھپھو نے اپنے گھر شفٹ ہونے کی بات کی۔
پھر اگلے دو دن تک سننے میں آیا کہ انجو مامی اور مدیحہ پھپھو آج کل بازار میں ہر جگہ اکٹھی دکھائی دے رہی ہیں۔
اس روز افطاری کے بعد وہ سب بلال بھائی کی لائی ہوئی آئس کریم پر چھینا جھپٹی کر رہے تھے جب اچانک ہی شاہ زین چلا آیا۔ بڑا بے نیاز سا بن کر سامنے بیٹھ رہا۔ آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔
ابا بھی ڈھیٹ بنی آئس کریم کھانے میں جتی رہی لیکن نظر کا کیا تھا۔ کبھی نہ کبھی بھٹک ہی جاتی لیکن جب بھی دیکھا، دل نے اپنی دھڑکن گنوائی۔
"ضمیر مطمئن ہو جائے گا پر دل ہار جاؤ گی عظمی نایاب!" اواسی قطرہ قطرہ اسے بھگونے لگی تو وہ یونہی کسی کام کے بہانے محفل سے اٹھ آئی۔
شاہ زین نے پرخیال نظروں سے اس کا تعاقب کیا۔
"محترمہ کے انداز کچھ شکست خوردہ سے لگ رہے ہیں۔ نہ شوخی نہ شرارت۔ نہ کوئی چھیڑ خانی۔" وہ کچھ الجھا۔
نظروں کا زاویہ بدلا تو افشین کو بالکل اپنے سامنے پایا۔
کچھ لمحے خالی خالی نظروں سے اسے گھورتی رہی۔

"اگر آپ اپنی مونچھوں کا اسٹائل تھوڑا بدل لیں تو بالکل نعمان اعجاز لگنے لگیں۔"

"ہیں! شاہ زین کی مونچھیں ہیں؟" طلال فوراً اس کی طرف پلٹا۔

"اور... نعمان اعجاز کی مونچھیں ہیں کیا؟" یہ رابعہ بھابھی تھیں۔

"تو کیا نہیں ہیں؟"

"ارے سنو! بھلا نعمان..." بات کہاں سے کہاں جا نکلی تھی۔

شاہ زین کو دیر ہونے کا احساس ہوا تو جھٹ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ یوں بھی اب محفل میں "جان" نہ رہی تھی تو وہ کیونکر رکتا۔

☆ ☆ ☆

"ہرگز نہیں۔ اس رشتے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" شیراز حسن نے سنا اور انکار کر دیا۔

قطعی اور فوری انکار۔

ایسا انکار جس سے پہلے سوچ کا ایک لمحہ بھی انہوں نے ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا تھا۔ تائی اماں تو بات کر کے ابھی سانس بھی نہ لے پائی تھیں کہ شیراز حسن نے یہ ٹکا ان کا ران کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔

"عائشہ نے بڑے مان سے کہا ہے مجھ سے۔ حالانکہ مدیحہ شاہ زین کے لیے اوما کا کہہ چکی ہے مگر وہ..."

"اماں! مجھے بہت ضروری کام ہے اس وقت۔" ایسا خشک اور کورا لہجہ۔

ان کی آنکھیں بھر آئیں... ابھی تو عائشہ ان کے کمرے میں ہی بیٹھی ہوں گی، ابھی تو دل میں بڑا جوش کن سا خیال ابھرا تھا کہ اوما اور شیراز میں دوستی ہو سکتا ہے کسی نئے تعلق کی بنیاد بن جائے... ہو سکتا ہے کچھ ایسے جذبات ان کے درمیان جڑ پکڑ چکے ہوں جو نئے رشتے استوار کر سکیں... مگر یہاں... وہ چہرے پہ پتھر سی سنجیدگی لیے اپنے لیپ ٹاپ پر کھٹا کھٹ کیے جا رہا تھا... وہ مرے مرے قدم اٹھاتی اپنے کمرے کی طرف چلیں۔

اور پھر یہ ہی ٹکا سا انکار اوما تک بھی پہنچ گیا۔

"لو جی... جان چھوٹی... ایک منٹ میں انکار... ادھر بھابھی گئیں... ادھر واپس۔ کوئی دوسری بات تو اس نے سنی ہی نہیں... تم نے اپنا فرض نبھایا... اچھا کیا۔ اب بھلا ہو تمہارا، کچھ خیال دل میں ہے بھی تو اب نکال چکو، شام کو تمہارے تایا ابو سے بات کر کے مدیحہ کو خوشی کی خبر سنا دوں گی۔" امی کی تو جیسے مراد بر آئی تھی۔

"یوں تو شیراز بھی اپنا ہی بچہ ہے... لیکن پہلی محبت کی جڑیں بڑی گہری ہوتی ہیں، اسی سے خوف آتا تھا... اب دیکھ لو، اسی کی یادوں کو سینے سے لگائے بیٹھا ہے، کوئی کرے تو کرے کیا۔"

اوما سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ سر جھکائے عید کے لیے لائے جانے والے سامان کی فہرست بناتی رہی۔

امی کہہ چکنے کے بعد جائے نماز بچھا کر کھڑی ہو گئیں۔

اس نے طیش میں آ کر ساری لسٹ پرزے پرزے کر کے اڑائی، باتھ روم میں جا کر ڈھیر سارا روئی۔

"اپنا دل اجاڑ کر ان کا خیال کر رہی ہوں، اور یہ ہیں کہ..."

رو پیٹ کر بھی سکون نہ آیا تو دھڑ دھڑ دو، دو سیڑھیاں الانگتی پھلانگتی سیدھی شیراز حسین کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

"ٹھکرائے جانے کا غم سہا ہے آپ نے... پھر بھی ٹھکرا دیا، یوں بھی کوئی کرتا ہے، بہت ظالم ہیں آپ شیراز حسن۔" آنسو تو ساون بھادوں کی بارش ہو گئے، چھاجوں چھاج برس رہے تھے۔

"بہت بڑا نقصان کر لیں گے آپ اپنا، مت انکار کریں، میں نے سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔"

"سوچ سمجھ کا اس فیصلے سے کوئی تعلق دکھائی نہیں دیتا، سراسر نادانی، کم عقلی۔" کتاب میں مگن، بڑے آرام سے کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے جواب دیا۔ لہجہ

اس نے کتاب جھپٹ کر دور اچھالی اور بدتمیزی سے انہیں گھورے گئی۔

"کافی گرم ہے۔" انہوں نے کسی خدشے کے تحت بتایا۔

"پتا نہیں کس زعم میں ہیں آپ؟ میں روز، روز آپ کی منتیں کرنے نہیں کھڑی ہوں گی یہاں... بیٹھے رہا کریں گے یوں ہی، کرسی یہ، پھپھوندی لگ جائے گی، کوئی پوچھنے والا بھی نہ ہوگا، ہر کوئی عظمی نایاب نہیں ہوتا کہ گھڑی گھڑی چائے، کھانا لے کر حاضری دیتا رہے، وہ بزرگوار والدہ ہیں آپ کی جنہیں دنیا کے غموں سے ہی فرصت نہیں... ہونہہ... مردہ محبت کا جنازہ کب تک اٹھائے رکھیں گے... وہ محترمہ چار بچوں کی اماں جان بن گئی ہوں گی اور یہاں ابھی سوگ جوان ہے، اب مسکرائے چلے جا رہے ہیں۔" وہ تھک کر کشن پہ بیٹھ گئی۔

"ہاں بھئی... کشکول ہاتھوں میں لے کر آ گئی ہوں، میرے ساتھ یہی سلوک ہونا چاہیے۔"

"پگلی ہو تم اوما... بالکل فضول بول رہی ہو۔" انہوں نے ہولے سے جھڑکا۔

"نہیں... آپ مجھے اس طرح نہیں کہہ سکتے... میں نے کوئی پاگل پن نہیں دکھایا۔" وہ سچ مچ روٹھی ہوئی تھی۔

"میں آپ کی خوشی چاہتی ہوں، آپ کو ہنستے بستے..."

"میری خوشی چاہتی ہو تو... وہ کرو جو میں کہتا ہوں، ابا جان گھر کی بڑی ہونے کی حیثیت سے تمہیں بلا کر رائے لیں گے اور تمہیں ہاں کے سوا اور کچھ نہیں کہنا۔"

"مجھے سبق پڑھانے کی ضرورت نہیں، میں جانتی ہوں مجھے کیا کرنا ہے۔" اس کا ارادہ اٹل لگ رہا تھا۔

"تو پھر یاد رکھو، میری طرف سے کوئی حوصلہ افزائی نہ ہوگی۔"

"مجھے اپنے ارادوں کی تکمیل کے لیے دوسروں کے

حوصلوں کی ضرورت نہیں پڑتی۔" وہ تن کر اٹھ کھڑی ہوئی' اس سے پہلے کہ کمرا چھوڑ جاتی انہوں نے سخت لہجے میں پکار لیا۔

"صرف ایک بات کا جواب دے دو۔"

اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ان کی گہری نگاہیں اس کے چہرے کو کھوج رہی تھیں۔

"تم مجھے آباد کرنا چاہتی ہو' یا آباد ہوتے دیکھنا چاہتی ہو؟"

اس ایک سوال پر وہ لمحہ بھر کے لیے تھرا کر رہ گئی تھی۔ یوں ہی آنکھیں کھولے چپ انہیں دیکھے گئی۔

"اگر میں کسی اور کی ہمراہی چاہوں تو تم دستبردار ہو جاؤ گی؟"

"آپ جھوٹ بول رہے ہیں؟"

"نہیں' میں جھوٹ نہیں بولتا' لیکن اگر واقعی کوئی ہو تو؟"

"اف خدایا! مت امتحان لیں شیراز بھائی' اگر کوئی ہے تو بتا کیوں نہیں دیتے؟ کیوں مشکل میں ڈالتے ہیں۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"کوئی ہے تو سہی اوما! لیکن ابھی بتانا نہیں چاہتا' لیکن یہ ہے کہ اگر تم شاہ زین کے لیے ہاں کہہ دو تو اسی روز میں بھی کوئی بندھن باندھ لوں گا۔" ان کی زیرک نگاہیں واضح طور پر اوما کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو محسوس کر رہی تھیں۔

جیسے پھانسی گھاٹ پر کھڑے شخص کو زندگی مل جائے' بالکل ویسی ہی چمک اس کی آنکھوں میں یک لخت ہی اتر آئی تھی۔

"میں واقعی تمہیں بہت اچھی طرح جانتا ہوں اوما!" وہ کچھ سوچ کر مسکرائے۔

"آپ سچ کہہ رہے ہیں نا' بالکل سچ؟"

انہوں نے پر یقین انداز میں سر ہلایا۔ تو وہ جیسے کسی بھاری بوجھ سے آزاد ہوتے ہوئے سرشاری سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تو کیا میں شاہ زین کے لیے ہاں کہہ دوں؟"

شیراز حسن کے چہرے پہ بے اختیار ہی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"بصد شوق' اور ہاں' یہ نظم صرف تمہارے لیے' منگنی کا تحفہ سمجھو۔"

انہوں نے ایک کتاب میں نشان لگایا پھر اسے تھما دی۔

☆ ☆ ☆

اتنا ہی یاد رکھ مجھے
جیسے کسی کتاب میں
بیتے دنوں کے دوست کا
اک خط پڑا ہوا ملے
لفظ مٹے مٹے سے ہوں
رنگ اڑا اڑا سا ہی
لیکن وہ اجنبی نہ ہو
اٹھ کر تیرے گلے لگے
بھولے ہوئے تمام سکھ
بیتے دنوں کی سب کتھا
تجھ سے کہے اور رو پڑے
اتنا ہی یاد رکھ مجھے
بیتے دنوں کے دوست کا
جیسے کوئی خط ہوں میں
رکھا ہوا کتاب میں

اس نے کئی بار اس نظم کو پڑھا اور پھر کتاب تکیے کے نیچے رکھ کر کروٹ بدل لی۔ رات ہولے ہولے بھیگ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

آج تیسواں روزہ تھا۔

اور کل انتیسویں روزے ان سب نے گھر کی تیسری منزل کی چھت پر کیسا شور اور ہنگامہ مچایا ہوا تھا۔ لیکن چاند تھا کہ گھنے بادلوں کی اوٹ سے اپنی چھب دکھلانے پر راضی ہی نہ ہوا۔ ٹیپو کی نئی نکور دوربین بھی کوئی فائدہ نہ دے سکی۔ وہ اس کی مدد سے ایک ایک کے چہرے کا بغور جائزہ لیتا رہا۔

"تمہارے چہرے پہ ناک بہت عجیب لگتی ہے۔"

"تم لوگوں کا دماغ خراب ہے' اتنے بادلوں میں پہلی تاریخ کا چاند بھلا کہاں دکھائی دے گا۔" رابعہ بھابھی منہ اٹھائے گھنے بادلوں کی بڑھتی ہوئی تاریکی دیکھ رہی تھیں۔

"ارے دیکھ' وہ چاند۔" کوئی پکارا۔

"نہیں کم بخت! وہ تو بخاری انکل کی چندیا ہے' ہاہا۔۔۔ہا۔"

"نہیں یار' وہ تو ان کی نازک مزاج صاحب زادی کا ابرو مثل چاند دکھائی دے رہا ہے۔"

"تو بڑا پہچانتا ہے' اسی لیے آئے روز۔۔۔" پتا نہیں کہنے والا کیا بھید کھولنے جا رہا تھا۔ اسے بانہوں میں جکڑ کر منہ ہی دبوچ لیا گیا۔ اب وہ غوں غوں غاں غاں کرتا ہاتھ کے اشارے سے دوسروں کو کچھ سمجھانے کی کر رہا تھا۔

"روزہ دارو' اللہ کے پیارو' جنت کے حق دارو!"

"عید کا چاند نظر نہیں آیا' تیسویں روزے کی تیاری کر لو۔"

ضوبیا بھونپو بجاتی تینوں منزلوں پہ اعلان کرتی رہی۔

"ہم سب یہاں کتنے آزاد ہیں' اور فطرت کے کتنے قریب۔" اوما دونوں بازو پھیلائے تیز ہوتی ہوا میں جھوم رہی تھی۔

"ابھی کچھ دیر بعد ہم بادلوں کے رتھ پر سوار ہوں گے۔۔۔اور۔۔۔"

"دھڑام سے پائیں باغ میں جا گریں گے۔۔۔ہاہا۔۔۔ہا۔"

اور پھر رات گئے تک وہ سب ہی دائرہ بنائے محو گفتگو رہے' تاریکی بڑھتی رہی اور بادلوں کا ہجوم بھی۔ نہ چاند نظر آیا' نہ بارش برسی' وہ لوگ آہستہ آہستہ تھکنے لگے تو ایک ایک کر کے نیچے اتر آئے' جہاں تائی' چچیاں آج پہلی دفعہ سحری بنانے کی ابتدائی تیاریوں میں لگ گئی تھیں۔

آخری روزے کی افطاری کا وقت تھا۔

تایا ابا نے رقت آمیز لہجے میں ایک طویل دعا کی ہو رہی تھیں۔ خدا جانے دوبارہ یہ مبارک مہینہ دیکھنے کو ملے یا نہ ملے۔ انہوں نے باقی سب کو بھی اداس کر دیا تھا۔

افطاری کے بعد کھانے کا طویل دور چلا' پھر چائے اور کافی' مدیحہ پھوپھو بھی افطاری میں موجود تھیں۔ نوجوان نسل ان سے کچھ ہٹ کر اپنی سرگرمیوں میں مصروف ہوئی' تو انہوں نے تایا ابا کے سامنے اپنی گزارش نہایت موزونیت کے ساتھ پیش کر دی۔

"عائشہ سے بات کی ہے میں نے' مگر وہ چاہتی ہے کہ اس گھر کے سربراہ کی حیثیت سے فیصلے کا حق آپ کو ہی حاصل ہے۔"

تائی اماں کے توسط سے عائشہ یہ بات پہلے ہی تایا ابو تک پہنچا چکی تھیں۔ بڑی' چھوٹی چچی کو البتہ جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہے؟" نظروں ہی نظروں میں اس سوال کا تبادلہ ہوا۔

"تم لوگوں کی اس بارے میں کیا رائے ہے۔" تایا ابا نے دھیمے لہجے سے باقیوں کی رائے لی۔

"جو آپ مناسب سمجھیں بھائی جان! آپ کا فیصلہ ہی ہمارا ہے۔" بڑے چچا نے بڑے سبھاؤ سے ان کا مان بڑھایا۔

"ہوں۔" چند لمحوں کی سوچ پھر سوال۔

"بچوں سے رائے لی؟"

"شاہ زین نے انتخاب کا حق مجھے دیا ہے بھیا! اوما باقی لڑکیوں سے بڑی ہے' پھر باپ کی طرف سے نا آسودہ۔۔۔ہو سکتا ہے میں اس عمل سے گزشتہ رویوں کی تلافی کر سکوں۔ وحید کے ساتھ کوئی بہت اچھا سلوک نہیں کیا ہم نے۔" انہوں نے سکھا' پڑھا کر بھیجا گیا جواب دیا۔

"ہوں' بلال کو بلاؤ ذرا' فاران کو بھی۔"

دونوں آموجود ہوئے۔

"رات کو فنکشن ہے اوما اور شاہ زین کی منگنی کا' انتظام کرو' اور بچیوں کو بتا دو۔"

"کیا؟"
"نہیں۔"
"ہائے... اوما اور شاہ زین؟"
"نہیں، نہیں شاہ زین اور اوما۔"
"مدیحہ پھوپھو کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"
"طبیعت ٹھیک... نظر کمزور ہے۔"
"آہا... ہم تو چلے مہندی لگوانے۔" ضویا لچکتی، مٹکتی ارم کی طرف چل دی۔
"اُفوہ... اتنی جلدی، یہ کیا بھئی۔" اوما بڑی کسلمندی سے پڑی تھی جب اسے کھینچ کھانچ کر گاڑی میں پہنچا گیا۔
"جاکر شکل درست کر آؤ اپنی۔" رابعہ بھابھی گویا گاڑی کو دھکا لگا کر ہی واپس پلٹی تھیں۔
"کیا ہو جاتا، اگر یہ کام صبح عید کے روز رکھ لیا جاتا۔" خضریٰ اس کے ساتھ پریشان سی بیٹھی تھی۔
"کیوں تمہیں کیا تکلیف ہو رہی ہے۔" اوما مزے سے بیوٹیشن کے سامنے بیٹھی مسکرائے جا رہی تھی۔
واپسی پر ارسلان لینے آیا تھا۔ ساتھ میں کوئی اور بھی جلا بھنا بیٹھا تھا۔
"یہ بڑے ماموں نے میرے داخلے پر پابندی کس خوشی میں لگائی ہے۔"
"بڑے ماموں سے پوچھیے۔" ازلی بے نیازی۔
"تو میرے بغیر منگنی کیسے ہوگی۔"
"یہ بھی ان ہی سے پوچھیے۔"
"انگوٹھی کون پہنائے گا۔" ہلکی سی بڑھی ہوئی شیو میں وہ خاصا غمگین لگ رہا تھا۔
"یار! اگر کوئی بے اعتباری ہے تو میں پہنا دوں گا۔" ارسلان سنجیدہ تھا۔
"نکو نہیں۔" وہ سچ مچ رنجیدہ تھا۔
"اچھا بھئی کرتے ہیں کچھ، ویسے اوما آج خوب صورت لگ رہی ہے۔" ارسلان نے آنکھ دبا کر شاہ زین کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔
"ہمیشہ کی طرح۔" وہ چہکی، مگر سامنے جذبے لٹاتی دو آنکھوں نے بے اختیار ہی نظریں چرانے پر مجبور کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

پائیں باغ میں روشنیوں، رنگوں اور خوشبوؤں کا سیلاب امڈ آیا تھا۔
ہنسی، لطیفے، مذاق، قہقہے، باتیں۔
رات اپنے جوبن پر تھی۔
ہوا پچھلے پہر ہونے والی بارش کی نمی سے بوجھل ہو رہی تھی، ہلکی سرسراہٹ کے ساتھ معطر ہوا لڑکیوں کی نوخیزی چھوتی تو وہ خوامخواہ ہی اپنے آپ میں سمٹنے لگتیں۔
انجو مامی اور ریاض ماموں بھی بچوں کے ساتھ پہنچ چکے تھے۔
"یہ اچھا کیا بڑے بھیا نے جو کھانے کا انتظام کر لیا، دیکھیے کچھ دیر میں سب کو بھوک بھی لگنے لگی۔" عائشہ چچی نے بلال بھائی کو برتن لگواتے دیکھ کر کہا تھا۔
"یار پلیز! میرا ابھی کچھ کرو نا۔" ضویا خضریٰ کے کندھے دبا رہی تھی۔
"ذرا انتظار میری بچی! ہم قربانی بس بڑی عید پر ہی کرتے ہیں۔" خضریٰ اسے تھپکی دینے لگی۔
شیراز حسن فاران بھائی کے ساتھ سیٹ سنبھالے بیٹھے تھے۔
"بھئی لے کر آؤ، کہاں ہے اوما، چلو بھئی مدیحہ! رسم کرو، وہ لڑکے ادھر اندھیرے میں کیا کر رہے ہیں؟ بلاؤ سب کو۔" تایا ابا آئے تو آتے ہی تھر تھلی مچا دی۔
"جلدی کرو، تایا ابو ڈانٹیں۔" رابعہ بھابھی کی دہائی، اوما کی سینڈل پہنی اور بھاگ کر مرکزی سیٹ سنبھال لی۔
"لاؤ بھئی، اب کیا سوچ رہی ہو؟" انہوں نے مدیحہ کے ہاتھ سے انگوٹھی جھپٹی، گھما پھرا کر دیکھی، اس سے قبل کہ خود ہی پہنا دیتے کوئی سیاہ چادر میں لپٹا وجود ان پہ جھکا۔
"دکھایے تو ذرا۔" تایا ابا کی ایک ثانیے کی حیرت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انگوٹھی ان کے ہاتھ سے بڑی

کاری درخت لگ چکا ہے، اس کی شاخیں البتہ ابھی پانی میں نہیں جھکیں۔ تاہم پرزور اصرار پر جناب حضرت شاہ زین شاخیں ہاتھ میں لے کر پانی میں جھکائے رکھیں گے، مزید اطلاع... کہ گلاس وال کے پاس اسٹیریو بھی رکھ دیا ہے۔ جگجیت صاحب کی سی ڈی نے چلنے سے انکار کر دیا، فی الحال جو سی ڈی چلنے کے لیے تیار حالت میں پڑی ہے وہ نور جہاں صاحبہ کی ہے اور گانا... ٹیپو..." رومی کی پکار اور پھر ان کی بے ہنگم آوازیں۔

میں تے میرا دلبر جانی
بلیاں تے پیار کہانی
سانواں وچ آیا ای طوفان
موسم ہویا اے بے ایمان

☆

"جازت ہے؟" شرارت بھرا انداز۔
تایا ابا بڑی دیر بعد اپنی حیرت سے نکلے، اور پھر اکیسویں صدی کی نوجوان نسل سے سمجھوتا کر کے اثبات میں سر ہلا دیا۔
ایک لمحے کا توقف کیے بغیر اس کے ہاتھ سے انگوٹھی اوما کی انگلی میں منتقل ہو گئی تھی۔ لڑکوں کی ہاؤ ہو اور مبارک باد سے سارا ماحول گونج اٹھا تھا۔
"چلو بھئی اب تم اٹھو یہاں سے، ٹیکسٹ۔"
"ہائیں۔" کسی نے اوما کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔
اور اگلے ہی پل ارم شرماتی، لجاتی اس کی جگہ فٹ ہو گئی تھی۔
"کیوں بھئی شیراز حسن تمہارا کیا ارادہ ہے؟" تایا ابا نے برابر بیٹھے شیراز کو دیکھا اور شاہ زین کی نقل میں اسی انداز میں پوچھا۔
"جازت ہے؟"
اس بات پر سب ہی نے قہقہہ لگایا، اور تایا ابا نے ارم کو شیراز حسن سے منسوب کرتے ہوئے انگوٹھی اسے پہنا دی تھی۔
"اف بدتمیز! وہ تم تھیں، چھپی رستم، نہ بتایا، نہ پوچھا، الٹا میری جان مصیبت میں۔" اوما مٹھیاں بھینچے ارم کی طرف لپکی۔
باقی سب کھانے میں مصروف تھے۔ ارم آنکھوں میں نمی لیے بس مسکراتی جا رہی تھی۔
"کل مدیحہ پھوپھو کے ہاں دعوت طعام کی عام دعوت ہے۔ خاص دعوت صرف اوما جی کے لیے اور ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ حوض کنارے انار